مسعود حسن شہابی

اردو اکادمی ○ بہاولپور

۷۸۶

خواجہ غلام فریدؒ

مسعود حسن شہاب

اردو اکادمی بہاولپور

بار اول . . . ۱۹۶۳ء

مصنف . . . مسعود حسن شہاب

طابع و ناشر . . . اردو اکادمی بہاولپور

مطبع . . . اشرف پریس لاہور

قیمت . . . چھ روپے

انتساب

جناب بشیر احمد قریشی سی۔ ایس۔ پی کے نام

ترتیب

۱ نذرِ عقیدت (نظم) مصنف ۷

۲ پیش لفظ۔ میجر شمس الدین محمد سابق وزیر معارف ریاست بہاولپور ۱۰

۳ خواجہ غلام فریدؒ کی شخصیت ۱۹

۴ خاندان و نسب ۲۷

۵ خواجہ صاحب کی زندگی ۳۴

۶ خواجہ صاحب بحیثیت شاعر ۸۵

۷ خواجہ صاحب کی زبان ۹۱

۸ خواجہ صاحب کی شاعری ۱۰۴

۹ خواجہ صاحب پر دوسرے شعراء کا اثر ۱۱۲

۱۰ تصوف اور خواجہ غلام فریدؒ ۱۲۱

۱۱ خواجہ غلام فریدؒ ایک سالک کے رنگ میں ۱۳۷

۱۲ انسانی مرتبہ خواجہ صاحب کی نظر میں ۱۵۵

۱۳ خواجہ صاحب کے کلام میں مذلت و رسوائی کا پہلو ۱۵۹

۱۴ خواجہ صاحب کا تصورِ عشق ۱۶۳

۱۵	خواجہ صاحب کے کلام میں مجازی رنگ	۱۷۳
۱۶	خواجہ صاحب کے کلام میں یاس و رجائیت کی ہم آہنگی	۱۸۵
۱۷	خواجہ صاحب کی بہاریہ شاعری	۱۹۹
۱۸	روہی اور خواجہ غلام فرید	۲۰۵
۱۹	خواجہ صاحب کی شاعری کی فنی خوبیاں	۲۲۱
۲۰	خواجہ صاحب کے کلام میں دوسری زبانوں کی آمیزش	۲۳۹
۲۱	خواجہ صاحب کے دوہے	۲۴۶
۲۲	قصیدہ گوئی اور خواجہ صاحب	۲۵۰
۲۳	کافیاں اور اُن کا منظوم ترجمہ	۲۵۷
۲۴	خواجہ صاحب کی اردو شاعری	۳۱۳
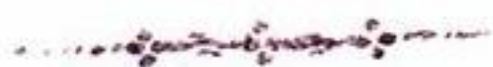
نذرِ عقیدت

دور تنہائیوں میں ایک فقیر — نغمہ پیرا تھا رہگزاروں میں
کر رہا تھا مشاہداتِ جمال — دے رہا تھا سبق اشاروں میں
تپتے صحرا کا یہ شہیدِ وفا — خوشنما پھول تھا شراروں میں
اِک مقامِ بلند رکھتا تھا — آدمیت کے غمگساروں میں
بادشاہوں میں بادشاہ تھا وہ — خاک آسا تھا خاکساروں میں
وہ اکیلا رہا تماشائی — حُسنِ فطرت کی رہگزاروں میں
نگہِ شوق سے کئے سجدے — دیکھ کر حُسن چاند تاروں میں
جسقدر بھی علومِ باطن ہیں — پیش خدمت رہے قطاروں میں
فلسفہ زندگی کا سمجھایا — کچھ کنایوں میں کچھ اشاروں میں
رمزِ عشق و جمال اور رومان — تھے تخیل کے شاہکاروں میں
خار و خس اور گیاہ صحرائی — کر لئے جذب استعاروں میں
بھیڑ بکری کے تشنہ لب ریوڑ — بہہ گئے شاعری کے دھاروں میں

فلسفۂ معرفت، تصوف و حسن — تھا وہ فردِ فرید چاروں میں
چھیڑ کر تارِ سازِ ہستی کے — راگ پھیلا دیئے بہاروں میں
دشتِ بے آب لہلہا اٹھا — شعر و حکمت کے سبزہ زاروں میں
دل کو آسودگیٔ فکر ملی — جذبِ طوفاں تھمے کناروں میں
مسکرائی زمین روہی کی — خلد اتر آئی ریگ زاروں میں
نغمے معرفت کے گونج اٹھے — غمِ دوراں کے آبشاروں میں

تھا گدا جو درِ محبت کا
تھا جو فطرت کے رازداروں میں
جس نے صحرا میں دی اذانِ وفا
روح دوڑائی غم کے ماروں میں
جس نے پھولوں کو رنگِ نو بخشا
ڈال دی جس نے جان خاروں میں

تھی جو میخانۂ حقیقت میں — وہ مئے فکر آج ہے نایاب
لیکن اس کا اثر ہے اب بھی عیاں — صورتِ مہر و انجم و مہتاب
فکر کی روشنیٔ پیہم سے — جگمگاتی ہے عقل زیرِ حجاب
کشمکش حسن و عشق کی نہ رہی — کھل گئے صلح و آشتی کے باب
سامنے ہے حقیقتِ اشیاء — اُٹھ گیا روئے معرفت سے حجاب
قیدِ زنجیرِ واہمہ ٹوٹی — اپنی تعبیر ہو گیا ہے خواب
ہٹ گئی راستے سے ہر دیوار — ہر طرف رنگ و بو کا ہے سیلاب

نکہت افزا فضائے دہر میں ہے — اک بیاباں کے رنگ رنگ گلاب
رگِ ہر سنگ سے لہو پھوٹا — قلبِ صحرا سے نکلی جوئے آب
اشک ہیں غیرتِ مئے کوثر — غم ہوا لاکھ جنتوں کا جواب
قصرِ خورشید جگمگا اٹھا — رقص میں ہے سفینۂ مہتاب
وا ہوا سینۂ غلام فریدؒ — یہ ہے عرفان و آگہی کی کتاب
ہمہ خوبی سے متصف ہر شعر — ایک تلوار ایک موجِ شراب
مکتبِ فکر اس کا دنیا کو — پیش کرتا ہے زندگی کا نصاب
زندگی کو بقا کا درس دیا — اللہ اللہ یہ اہتمام حباب
ہے مرا قلب ہدیۂ ناچیز — نذر کرتا ہوں میں یہ پیشِ جناب
کاش! میں بھی نیازمندی کا — خسروانہ ادا سے پاؤں جواب

گامزن ہوں اِدھر بھی خواجہ فریدؒ
ذرۂ خاکِ رہگذر ہے شہاب

پیش لفظ

محمد ظفر بہادر شاہ کی دِلّی ایک اُجڑا ہُوا گلستان تھا اور مغلیہ خاندان کے انحطاط کی آخری گھڑی۔ نادر شاہ کے حملے کے بعد سلطنت ایسے وزراء کے ہاتھ میں آگئی تھی جو بجائے مغلیہ سلطنت کو تقویت پہنچانے کے اپنی اپنی حکومتیں قائم کرنے میں زیادہ مصروف تھے۔ مرہٹوں کے آئے دن کے حملوں سے اہلِ دہلی میں بطور خاص اور دیگر مسلمان عوام میں بالعموم اک گونہ یاس و ناامیدی کے آثار نمایاں ہوگئے تھے۔ جس طرح سلطنت عباسیہ کے ختم ہونے پر طوائف الملوکی کا ایک بہت بڑا دور شروع ہُوا تھا اسی طرح سلطنت مغلیہ کے زوال پذیر ہونے پر ہندوستان میں افراتفری کا بازار گرم ہوگیا۔ یہ افراتفری نہ جانے کیا رنگ لاتی کہ روحانی پیشوا جو ہمیشہ ایسے مواقع پر اہم کردار ادا کرتے رہے ہیں۔ اسلام کی دیوار کو منہدم ہونے سے روکنے کے لئے میدانِ عمل میں آگئے۔ انہوں نے طوائف الملوکی کے اس دور میں جبکہ ہر طرف شراب ناب کی محفلیں گرم تھیں۔ امیرزادے لہو ولعب میں مصروف تھے اور کارپردازانِ حکومت دین و مذہب سے بیگانہ ہوئے جارہے تھے، تعمیر کردار کی ایک ایسی مہم شروع کی جس کے اثرات ان کے حجروں سے نکل کر محلات

اور امارت گاہوں تک پہنچ گیے۔

حضرت مولانا شاہ فخرالدینؒ کی شخصیت اس وقت نمایاں حیثیت رکھتی تھی۔ ابوظفر بہادر شاہ کے محل میں غفلت شعاری کے پردے اٹھانے میں ان کا بڑا ہاتھ تھا۔ یہ انہی کی خصوصی توجہ کا نتیجہ تھا کہ یہ فقیر صفت بادشاہ اکثر یاد الٰہی میں مصروف نظر آتا تھا۔ تعمیر کردار کی یہ مہم صرف دہلی اور قلعہ دہلی تک ہی محدود نہ تھی بلکہ شاہ فخرالدینؒ اور ان جیسے دوسرے بزرگان دین کے فیوض کا سلسلہ پورے ہندوستان میں پھیلا ہوا تھا۔ چنانچہ بہاول پور میں خواجہ نور محمد صاحبؒ مہاروی کا ورود اس پروگرام کی ایک کڑی معلوم ہوتا ہے۔ خواجہ نور محمد صاحبؒ مہاروی جو مولانا فخرالدینؒ دہلوی کے تربیت یافتہ تھے بہاول پور میں آکر عام لوگوں کی روحانی اصلاح میں مشغول ہو گئے۔ ان کی شمع ہدایت کی روشنی سابق ریاست بہاول پور کی حدود سے نکل کر سرحد پنجاب اور سندھ تک پھیل گئی اور اس فیض جاریہ کے نتیجے میں خواجہ محمد سلیمانؒ تونسوی۔ مولوی محمد جمالؒ ملتانی خواجہ نور محمدؒ نارووالی اور قاضی عاقل محمدؒ صاحب جیسے بزرگ روحانیت کے آسمان پر ضوفشاں ستاروں کی مانند چمکے۔

آخرالذکر بزرگ قاضی عاقل محمدؒ صاحب جنہیں خواجہ فخرالدینؒ دہلوی کی زیارت کا بھی شرف حاصل تھا۔ سلسلہ چشتیہ کے بڑے مفتخر بزرگوں میں شمار ہوتے ہیں۔ انہیں خود بھی ولایت اور سجادگی ورثے میں ملی تھی اور ان کے بعد بھی ان کے خاندان کے دوسرے افراد اس شرف سے یکے بعد دیگرے مشرف ہوتے رہے۔ خواجہ غلام فریدؒ اسی خاندان کے مائیناز فرزند تھے۔ انہیں خدا نے متعدد خوبیوں سے متصف کیا تھا۔ اگر ایک طرف وہ سالک راہ حقیقت کے روپ میں نظر آتے ہیں تو دوسری طرف ان کی علمی فضیلت

ہزاروں تشنگانِ علم کا مرکز و محور دکھائی دیتی ہے۔ شاعرانہ کمال اس پر مستزاد تھا انہوں نے شاعری کی نئی بنیادیں استوار کیں۔ فلسفہ۔ تصوف اور منظر نگاری ان کے انتہائی مرغوب موضوعات تھے۔ انہوں نے عام فہم تشبیہات اور استعاروں سے کام لے کر تصوف کے باریک سے باریک مسئلے کو اس خوبی سے بیان کر دیا ہے کہ ہر کس و ناکس اس سے لطف اندوز اور فیضیاب ہو سکتا ہے۔ وہ ورڈز ورتھ کی طرح فطرت کے بھی ترجمان معلوم ہوتے ہیں۔ ریگستانی معاشرے اور وہاں کے مناظر کی جو تصویر خواجہؒ صاحب نے کھینچی کر اس سے ہماری زبان کے ادب میں بے بہا اضافہ ہوا ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ ان کی شاعری نے بہاولپور کے ریگستان کو ایک ایسی زندگی عطا کر دی ہے جس کو کبھی زوال نہیں ہو سکتا

یوں تو خواجہ صاحبؒ کی زندگی اور شاعری پر بہت کچھ لکھا جا چکا ہے لیکن پھر بھی ایک ایسی کتاب کی ضرورت بڑی شدت سے محسوس کی جا رہی تھی جس میں خواجہؒ صاحب کی زندگی کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالنے کے ساتھ ساتھ شاعری کی جملہ خصوصیات پر بھی سیر حاصل تبصرہ کیا گیا ہو۔ زیر نظر کتاب نے اس کمی کو کافی حد تک پورا کر دیا ہے اس میں خواجہ غلام فریدؒ کی شخصیت۔ خاندان و نسب۔ خواجہؒ صاحب کی زندگی۔ سجادہ نشینی۔ خواجہ صاحب کا مسلک۔ عادات و خصائل۔ موسیقی کا شوق۔ خواجہ صاحب کا روحانی مجاہدہ و نفس۔ سفرِ حج اور خواجہ صاحب کی وفات کے موضوعات پر بڑے سُچے تُلے انداز میں قلم اٹھایا گیا ہے۔ اکثر سوانح نگار عقیدت کے جوش میں بعض شخصیتوں کی زندگی کے ایسے گوشوں کو تاریکی میں چھوڑ دیتے ہیں جن سے ان کے خیال کے مطابق ان کی عظمت میں کمی واقع ہوتی ہے۔ خواجہ صاحب کے سیرت نگار بھی ابتک یہی کرتے آئے ہیں۔ انہوں نے خواجہ صاحب کو گوشت پوست والا انسان بتانے کے بجائے عالم بالا کا

پیش لفظ

کوئی فرد ثابت کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس عقیدت نے خواجہ صاحب کی زندگی کے بہت سے اہم پہلوؤں پر پردہ ڈال دیا۔ زیر نظر کتاب اس اعتبار سے اور بھی وقیع ہے کہ اس میں صاحب تصنیف نے تحقیق و تجسّس سے کام لے کر بعض پوشیدہ حقیقتوں کو بے نقاب کر دیا ہے۔ خاص طور پر خواجہ صاحب کا رومان ایک ایسا موضوع تھا جسے انکی شاعری کے واضح اشاروں کے باوجود ابتک غلط ثابت کیا جاتا رہا تھا۔ یہ موضوع جہاں تحقیق کا طالب تھا وہاں حزم و احتیاط کا بھی متقاضی تھا۔ مجھے خوشی ہے کہ اس اہم ذمہ داری سے صاحبِ کتاب پوری طرح عہدہ برآ ہوئے ہیں۔

زیر نظر کتاب میں خواجہ صاحب کی زندگی پر تحقیقی نظر ڈالنے کے علاوہ مندرجہ ذیل موضوعات سے بھی بحث کی گئی ہے۔

۱۔ خواجہ صاحب بحیثیت شاعر ۲۔ خواجہ صاحب کی زبان ۳۔ خواجہ صاحب کی شاعری۔ ۴۔ خواجہ صاحب پر دوسرے شعراء کا اثر۔ ۵۔ تصوف اور خواجہ غلام فرید ۶۔ خواجہ فرید ایک سالک کے رنگ میں ۷۔ خواجہ صاحب کا تصورِ عشق ۸۔ خواجہ صاحب کے کلام میں مجازی رنگ ۹۔ یاس و رجائیت کی ہم آہنگی ۱۰۔ خواجہ صاحب کی بہاریہ شاعری ۱۱۔ روہی اور خواجہ غلام فرید ۱۲۔ خواجہ صاحب کی شاعری کی فنی خوبیاں ۱۳۔ خواجہ صاحب کے کلام میں دوسری زبانوں کی آمیزش ۱۴۔ خواجہ صاحب کے دوہے ۱۵۔ قصیدہ گوئی اور خواجہ صاحب۔

یہ ایسے موضوعات ہیں جن پر قلم اٹھانے کے لئے علمی بصیرت اور ناقدانہ نظر کے ساتھ ساتھ اس زبان سے کماحقہٗ واقفیت بھی ضروری ہے جس میں

خواجہ صاحب نے شعر کہے ہیں۔ میں صاحبِ کتاب جناب مسعود حسن شہاب کی علمی بصیرت اور ناقدانہ نظر کا تو پہلے ہی قائل تھا۔ لیکن اس کتاب کے مطالعے کے بعد مجھے یہ بھی اعتراف کرنا پڑا کہ انہیں ریاستی زبان پر بھی وہی دسترس حاصل ہے جو کسی دوسرے اہل زبان کو ہو سکتی ہے۔ اصل میں شہاب صاحب ریاست بہاول پور کے ہی قدیم باشندوں میں سے ہیں ان کے بزرگ آج سے تقریباً سو سال قبل بسلسلۂ ملازمت دہلی سے بہاول پور آ گئے تھے اور انہوں نے اس ریاست کو اپنا وطن بنا لیا تھا خود شہاب صاحب کی ابتدائی تعلیم و تربیت یہیں ہوئی ہے انہیں ریاست کی قدیم روایات تہذیب و ثقافت اور زبان و ادب سے جو گہری دلچسپی ہے اس کا عملی ثبوت انہوں نے یہ کتاب لکھ کر پیش کر دیا ہے۔

"خواجہ صاحب کی زبان" کے عنوان سے شہاب صاحب نے بہاولپوری یا ملتانی زبان کی جداگانہ حیثیت اس کی قدامت اور علمی و ادبی خوبیوں پر تبصرہ کرنے کے ساتھ ساتھ اس زبان کے نام کی اختلافی بحث کا بھی جائزہ لیا ہے۔ مجھے ان کی یہ رائے حقیقت پسندانہ معلوم ہوتی ہے کہ اس زبان کا ابتدائی نام سرائیکی تھا جو بعد میں مختلف علاقوں کی مناسبت سے ملتانی۔ بہاول پوری یا مظفر گڑھی وغیرہ ہو گیا۔ یہاں یہ بات مزید واضح کر دینے کے قابل ہے کہ جس طرح لفظ ملتانی کو ملتان کی سیاسی و ثقافتی اہمیت کی وجہ سے شہرت حاصل ہوئی اسی طرح بہاولپوری یا ریاستی کے نام بھی کم مقبول نہیں۔ اس کی وجہ والیان ریاست کی وہ روایتی ادب نوازی اور علم پروری ہے۔ جس کے طفیل ہر دور میں یہاں صاحبِ فن لوگوں کا جمگھٹا لگا رہا۔ خصوصاً شعرا میں شاید ہی کوئی بلند مرتبت شاعر ایسا گذرا ہو گا جس کی خدمت اور سرپرستی کا فخر

والیان ریاست کو حاصل نہ ہوا ہو۔ اس ذیل میں مولوی لطف علی مصنف سیف الملوک اور عبدالحکیم اوچی مصنف یوسف زلیخا کے نام خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ یہ صاحبانِ کمال امرائے بہاولپور کی سرپرستی میں اس علاقے کی زبان کو نکھاتے اور اس کے ادبی ذخیرے میں اضافہ کرتے رہے۔ ظاہر ہے جہاں زبان کو اس قدر پھولنے پھلنے کے مواقع میسر آئیں وہاں وہ زبان اس علاقے کی نسبت سے اپنا دامن کیسے بچا سکتی ہے۔

دورِ آخر کے سب سے مفتخر اور بلند پایہ شاعر خواجہ غلام فرید کو ہی لے لیجئے ان کا نہ صرف مسکن و مولد یہی سرزمین ہے بلکہ ان کی تربیت سے سجادگی تک کے مراحل طے کرانے کا فخر بھی والیان ریاست کو ہی حاصل ہے۔ اس کے علاوہ خواجہ صاحب کی قدر دانی کا جو حق اس خاندان نے ادا کیا ہے اس کا ثبوت خواجہ صاحب کی زندگی کے حالات کے علاوہ اس واقعے سے بھی ملتا ہے۔ کہ آج خواجہ صاحب کا جو کلام پورے ملک کے لئے باعثِ افتخار بنا ہوا ہے۔ اور جسے ہر کہہ و مہہ محبت و عقیدت سے پڑھتا ہے اس کو محفوظ کرنے کا سہرا بھی موجودہ نواب سر صادق محمد خان کے سر ہے۔ جنہوں نے سب سے پہلے ان کا کلام ایک دیوان کی صورت میں طبع کرایا۔ یہ ایسی عظیم الشان خدمات ہیں جن کی وجہ سے اس زبان کو بہاولپوری زبان کا نام دینے میں کوئی قباحت نظر نہیں آتی

ملتانی زبان کی خصوصیات کے ذیل میں شہاب صاحب کا یہ محاکمہ بالکل درست ہے کہ یہ زبان اردو بولنے والوں کے لئے بہت سہل الحصول ہے۔ میں یہاں اتنا اضافہ اور کرنا چاہتا ہوں کہ اردو کا اصل ماخذ ہی یہ زبان ہے جسے سیاسی انقلابات کے

زمانے میں ملتان کے رہنے والے اپنے ساتھ دہلی اور پنجاب کی طرف لے گئے۔
وہاں پہنچ کر یہ زبان اپنی انفرادیت تو قائم نہ رکھ سکی البتہ ایک نئی زبان کی تخلیق میں جس
کا نام اردو رکھا گیا یہ ممد و معاون ضرور ثابت ہوئی۔ آج اردو کے جو قدیم نمونے
ملتے ہیں ان میں اور ملتانی زبان میں بہت کم فرقِ معلوم ہوتا ہے۔ شہاب صاحب نے
اپنی کتاب میں خواجہ صاحب کی ایسی کافیوں کے چند نمونے بھی پیش کئے ہیں جو
اردو آمیز ہیں۔ میری رائے میں خواجہ صاحب کی وہ کافیاں بھی جنہیں خالصتاً
ملتانی زبان سے منسوب کیا جاتا ہے اردو الفاظ کا کافی ذخیرہ اپنے دامن میں
رکھتی ہیں۔ خواجہ صاحب کے کلام کو چھوڑیئے وہ تو ہفت زبان مشہور تھے۔
میں ذیل میں ریاست بہاول پور کے دو اور قدیم شعرا کا کلام پیش کرتا ہوں۔ جن
کے مطالعہ سے اردو ملتانی کی قرابت کا بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

حضرت خواجہ محکم الدین سیرانی جن کی خانقاہ سمہ سٹہ سے دو میل کے فاصلے پر
زیارت گاہِ عوام ہے ۱۱۹۰ھ میں فوت ہوئے تھے۔ یہ روحانی دنیا سے تعلق
رکھنے کے علاوہ شاعر بھی تھے اور کبھی کبھی ریاستی زبان میں بھی طبع آزمائی کیا کرتے
تھے۔ یہ شعر ملاحظہ ہوں۔

ہر کا ذات صفات ہزاراں   کس دا کس دا عطر نتھاراں
کیا مسجد کیا مندر کیا کعبہ دیر میاں   کل سیر و فی الارض خلاصہ سیر میاں

انہی کے خلیفہ دیوان محمد غوث خوشدل بھی ریاستی زبان کے بڑے باکمال شاعر
تھے ان کی کافی کے یہ شعر دلچسپی سے خالی نہ ہوں گے

اڑیل موج کیتی دریاواں کنول کندھی گج آئے
بر سر بوند برسن موتی شبنم گھا پسائے
ٹوٹن پھول سہاون چھپن لیاں پاند رنگائے
کنڈیاں دے گل کیسری جامے کرینہاں سوئے پائے

ان اشعار میں نتارنا اور اڑیل ایسے الفاظ ہیں جنہیں اردو داں آسانی سے سمجھ سکتے ہیں۔

میں نے زیر نظر کتاب کا بالاستیعاب مطالعہ کیا ہے اور میں یہ وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ خواجہ غلام فرید کے حالات زندگی اور شاعری سے متعلق اس سے پہلے اتنی جامع اور مبسوط کتاب شائع نہیں ہوئی تھی۔ شہاب صاحب نے تحقیق و تجسس اور نقد و نظر کا پورا پورا حق ادا کرنے کے ساتھ اس کیلئے جو دلکش اندازِ تحریر اختیار کیا ہے اس نے کتاب کی عظمت میں اور بھی اضافہ کر دیا ہے۔

کتاب کے آخیر میں خواجہ صاحب کی چند کافیاں اور ان کا منظوم اردو ترجمہ بھی شامل ہے ان کے مطالعے کے بعد میری یہ رائے اور بھی پختہ ہو گئی کہ منظوم ترجمے کا حق صرف وہی ادا کر سکتا ہے جو خود اچھا شاعر ہو۔ میں نے دیکھا ہے کہ بعض لوگ محض موزونیٔ طبع کے بل بوتے پر دوسری زبان کے شعراء کے کلام کا ترجمہ کر ڈالتے ہیں۔ ایسے تراجم نہ دلکش ہوتے ہیں اور نہ اصل شعروں کے صحیح عکاس۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ جو لوگ تراجم سے اصل مضمون کا اندازہ کرنا چاہتے ہیں۔ وہ اس کے متعلق کوئی درست رائے قائم نہیں کر سکتے۔

شہاب صاحب چونکہ خود ایک بلند پایہ اور نغز گو شاعر ہیں اس لئے انہوں نے ترجمے میں بھی اپنے معیار کو قائم رکھا ہے اور اس خوبی سے خواجہ صاحب کی کافیوں کو اردو نظم میں ڈھالا ہے کہ اس پر مشکل ہی سے ترجمے کا گمان ہوتا ہے پھر لطف یہ ہے کہ فن کے اس مظاہرے میں اصل مضمون کا بھی کہیں خون نہیں ہوا اس کامیاب کوشش پر شہاب صاحب مبارکباد کے مستحق ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ ان کی یہ تصنیف نہ صرف بہاولپوری زبان کے جاننے والوں میں مقبول ہوگی بلکہ اردو داں طبقہ بھی اس سے مساوی طور پر مستفید ہوگا۔

(میجر) شمس الدین محمد

سابق وزیر معارف ریاست بہاولپور

خواجہ غلام فریدؒ کی شخصیت

خواجہ غلام فریدؒ کی شخصیت متنوع صفات کی حامل تھی۔ وہ بیک وقت متبحر عالم بھی تھے اور صاحبِ دل بھی۔ ایک صوفی باصفا بھی تھے۔ اور بلند پایہ شاعر بھی۔ ان کے علوم ظاہری سے جہاں ہزاروں تشنگانِ علم سیراب ہوئے وہاں اُن کے باطنی علوم اور روحانی فیوض نے بے شمار مخلوقِ خدا کو بہرہ یاب کیا۔ ان کی شاعرانہ عظمت اس پر مستزاد تھی۔ ملتانی زبان میں ان کا ایک مکمل دیوان موجود ہے جو سوز و سازِ عشق - مناظرِ قدرت کی دِل کشی اور تصوف کے باریک مسائل سے بھرا ہوا ہے۔

مغربی پاکستان کی آبادی کا بیشتر حصہ ان کے اعجاز کلام کا قائل ہے علاقائی شعراء میں یہی ایک ایسے منفرد شاعر ہیں جنہیں ملتانی زبان کے جاننے والوں کے علاوہ دوسرے اہل زبان بھی قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں اور ان کی کافیوں کو محبت و عقیدت سے سنتے ہیں۔ "گوہرِ شب چراغ" کے مُصنّف نے لکھا ہے کہ "۱۸۹۷ء میں آپ کی مدح خوانی کا چرچا اس

حد تک ترقی پذیر ہوا کہ مشاعروں میں مصرعۂ طرح مجوز ہو کر آپ کی تعریف میں نظمیں پڑھی جانے لگیں۔ سب سے پہلے دہلی والوں نے جلسے کیے۔ پھر ان کی تقلید میں اہل الہ آباد نے بھی مدح خوانی کی محفلیں گرم کیں۔

خواجہ صاحب کی مدح سرائی کا یہ سلسلہ ہنوز جاری ہے۔ ہر سال بہاولپور ملتان اور دوسرے علاقوں میں ان کے یوم منائے جاتے ہیں۔ شعراء اور ادبا مضامین نظم و نثر کے ذریعے خراجِ عقیدت پیش کرتے رہتے ہیں اور ملکی رسائل و جرائد ان کی شاعری پر بالاہتمام مقالات شائع کرتے ہیں۔ ریڈیو پاکستان بھی اپنے مخصوص پروگراموں میں خواجہ صاحب کی جاں گداز و دل سوز کافیوں کو جگہ دیتا ہے واقعہ یہ ہے کہ خواجہ غلام فرید کی شخصیت اور ان کی شاعری بحد ہر دلعزیز، اور مقبول عام ہے۔ وہ ایک مادر زاد ولی اور وہبی شاعر تھے۔ انہوں نے اپنی شاعری کی بدولت جہاں ملتانی زبان کا پایہ علمی و ادبی زبانوں میں بلند کیا وہاں قوم کو بھی اپنے پرسوز کلام سے تڑپایا اور ان بلند مقاصد کی نشاندہی کی۔ جن کے حصول کے بعد انسان صحیح معنی میں انسان کہلانے کا مستحق قرار دیا جا سکتا ہے۔

خواجہ صاحب نرے شاعر ہی نہیں محققِ ادب اور مصلحِ زبان بھی تھے۔ انہوں نے نئی نئی تراکیب محاورے اور الفاظ کا اضافہ کر کے اس کی ادبی حیثیت میں چار چاند لگائے۔ زبان و ادب کی ترویج و ترقی کے سلسلہ میں انہوں نے جس تحقیق و تجسس سے کام لیا اس کا اندازہ اشاراتِ فریدی کے اس اقتباس سے لگایا جا سکتا ہے جس میں ملتانی زبان کے محاورہ "میرا مارو ڈھولا" کے استعمال کی

تحقیق کا ماحصل اس طرح درج ہے۔

"سخن در مجلس ہمایوں دریں میرفت کہ فلاں شہر کہنہ است و فلاں شہر نو است۔ حضور خواجہ ابقاہ اللہ تعالیٰ فرمودند کہ شہر ڈیرا ور در قریب زمانہ نبوی صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم تعمیر شدہ است و بناء جیسلمیر را نیز ہشت صد سال گذشتہ باشد و پگل ہم شہریست کہنہ و مارو۔ تارو کہ ہر دو خواہران بودند ہم از ساکنانِ شہر پگل ہستند مارو معشوقہ میاں ڈھولہ بودہ است و ڈھولہ نامی شخصے است ہندو کہ در ملک کچ بھج سکونت میداشت و فی زماننا ہر معشوق را ڈھولہ میگویند و گاہے نام مارو کہ معشوق ڈھولہ است با نام ڈھولہ کہ عاشق مارو است مرکب ساختہ مے گویند۔ "میرا مارو ڈھولہ" و ازیں ترکیب مطلق معشوق مراد میدارند"

ترجمہ:۔ مجلس مبارک میں یہ گفتگو ہو رہی تھی کہ فلاں شہر پرانا اور فلاں شہر نیا ہے۔ حضور نے فرمایا کہ شہر ڈیراور حضور نبیؐ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ کے قریب تعمیر ہوا ہے اور جیسلمیر کی بنار کو بھی آٹھ سو سال گذر چکے ہیں اور پگل بھی ایک پرانا شہر ہے۔ مارو تارو جو دو بہنیں تھیں وہ بھی شہر پگل کی رہنے والی تھیں۔ ان میں سے جو مارو تھی وہ میاں ڈھولہ کی معشوقہ تھی اور ڈھولہ نامی ایک ہندو شخص ہے جو کچ بھج میں رہتا تھا۔ فی زمانہ لوگ ہر معشوق کو ڈھولہ کہتے ہیں اور کبھی مارو کے نام کو ڈھولہ کے نام کے ساتھ جو کہ مارو کا عاشق ہے مرکب کر کے "میرا مارو ڈھولہ" کہتے ہیں اور اس ترکیب سے مطلق معشوق مراد لیتے ہیں"

خواجہ صاحب نے اگرچہ خود کافیوں کے علاوہ کسی اور صنفِ سخن میں زیادہ توجہ

صرف نہیں کی۔ لیکن جہانتک معلومات کا تعلق ہے ان کی تحقیق کا دامن اتنا وسیع تھا کہ وہ ملتانی زبان کی نظم کی تمام اقسام سے کما حقہٗ واقف ہی نہیں بلکہ ان کے موجد و مخترع کو بھی جانتے تھے۔ مقابیس المجالس میں لکھا ہے کہ ایک بار گلی میں سے کوئی شخص "گانمن" جو ملتانی زبان کے گیت کی ایک قسم ہے گاتا ہوُا گذر رہا تھا تو آپ نے فرمایا کہ "خیال گانمن" منشی غلام حسین ملتانی کی اختراع ہے۔ اس کے ساتھ ہی چھلہ گیت کے متعلق بھی بتایا کہ یہ سیّد میرن شاہ کی ایجاد ہے۔

خواجہ صاحب کو موسیقی کا بڑا اعلیٰ ذوق تھا۔ اور وہ اس فن کی تمام جزئیات سے پوری طرح آگاہ تھے۔ مقابیس المجالس میں درج ہے کہ " ایک بار فن موسیقی کا ذکر چھڑا تو فرمانے لگے کہ ہندوستانی موسیقی کے کل اصول چھ ہیں۔

۱۔ بھیری ۔ ۲۔ سری ۳۔ مینگھ ۴۔ ہنڈول۔ ۵۔ مال کوس ۔
۶۔ دیپک ۔ ان کے علاوہ جتنی راگنیاں ہیں وہ سب انہیں سے نکلتی ہیں۔

جہانتک خواجہ صاحب کی علمی بصیرت کا تعلق ہے اس کا اندازہ مشہور بہاولپوری مصنف مولانا عزیز الرحمٰن مرحوم کے مضمون کے مندرجہ ذیل اقتباس سے کیا جاسکتا ہے۔

"۱۸۸۹ء میں جب کہ میں ابھی مدرسہ دینیات بہاول پور کا طالب علم تھا۔ پہلے پہل مجھے حضرت خواجہ خواجگان چشت حضور خواجہ غلام فرید صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی زیارت کا شرف حاصل ہوُا۔ یہ تقریب اس طرح پیدا ہوئی کہ علمائے ہندوستان اور علمائے پنجاب میں بعض مسائل اختلافیہ میں مناظرہ کی ٹھنی تھی تو حضرت خواجہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کو حکم بنایا گیا۔ اور جون ۱۸۸۹ء میں دولت خانہ

عباسیہ عالیہ بہاول پور کے باہر حضرت خواجہ صاحب کے منزل قیام میں ہی مناظرہ ہوا تھا۔

ہندوستانی علماء میں سے حضرت شیخ الہند مولانا محمود الحسن قدس اللہ سرہٗ العزیز اور میرے پیرو مرشد حضرت مولینا خلیل احمد صاحب رحمۃ اللہ علیہ سرگروہ تھے اور پنجابی علماء میں سے مولوی غلام دستگیر صاحب اور مولوی سلطان محمود صاحب سرگروہ تھے۔ یہ مناظرہ بعض علمی نظریوں کے متعلق سید محمد نواز شاہ صاحب مرحوم چیف جج کی تحریک پر منعقد ہوا تھا۔ اگرچہ عوام کو شمولیت کی اجازت نہ تھی مگر میں بحیثیت طالب علم علمائے کرام کے لیے ضروری کتب لے کر مجلس میں پہنچاتا رہا۔

حضرت خواجہ صاحب قدس اللہ اسرارہم کی شان علمی کا وہ پہلا منظر اس وقت تک میرے دل و دماغ پر منقش ہے۔ میں نے چشم عقیدت و بصیرت سے دیکھا کہ اتنے بڑے علماء و فضلاء کے مابین علمی، منطقی اور فلسفی مباحث کے متعلق جو بزرگ حکم مقرر ہوتے ہیں ان کی جلالت قدر اور عظمت شان کا کچھ ٹھکانا ہی نہیں۔ حضور کے چہرۂ اقدس سے عالمانہ تمکنت اور فاضلانہ وقار ٹپکا پڑتا تھا۔"

خواجہ صاحب کا یہ علمی تبحر موروثی تھا۔ آپ کے بڑے بھائی خواجہ غلام فخرالدین جو آپ کے مرشد بھی تھے اور والد ماجد اور جدامجد سب اپنے وقت کے اکابر علماء میں سے گذرے ہیں۔ ان کے ہاں درس و تدریس کا سلسلہ ابتداء سے جاری تھا۔ خواجہ صاحب بھی بڑی باقاعدگی کے ساتھ

حدیث کا درس دیا کرتے تھے اور لوگ دُور دُور سے علم کی پیاس بجھانے کے لئے ان کے پاس آتے تھے

خواجہ صاحب بڑے سیر چشم۔ فراخ دل اور قناعت پسند بزرگوں میں سے تھے۔ ان کا دریائے فیض بلا استثنا ہر کہہ و مہہ کے لئے جاری و ساری تھا۔ خدا نے انہیں سرمایۂ دین کی طرح دنیاوی دولت بھی بے اندازہ عطا کی تھی۔ لیکن مال و دولت کے بارے میں ان کا نظریہ یہ تھا کہ جب دولت انسان کے پاس آتی ہے تو نفس اس سے خوش ہوتا ہے اور وہ خوشی انسان کو خدا سے دور کر دیتی ہے وہ کہتے تھے کہ اس کا دفعیہ اس طرح ہو سکتا ہے کہ جس قدر مال انسان کو ملے اسی قدر مال کما کر اس میں شامل کر کے خیرات کر دی جائے۔ چنانچہ ان کا اسی پر عمل تھا۔ وہ تمام مال جو ان کو ملتا تھا وہ اسے فوراً مستحقین اور حاجتمندوں میں تقسیم کر دیتے اور اگر اتنا مال مزید نہیں کما سکتے تھے تو اسی قدر مال قرض لے کر خرچ کر دیتے تھے کہتے تھے کہ وہ جب تک ایسا نہ کریں ان کے دل کو تسکین نہیں ہوتی۔

خواجہ صاحب کے مریدوں کا سلسلہ تمام ہندوستان میں پھیلا ہوا تھا۔ انہوں نے ہندوستان کے ہر چھوٹے بڑے شہر کا دورہ کیا تھا اور وہاں علماء و صلحاء سے ملاقاتیں کی تھیں۔ ان کی نیک نفسی تدین علمی بصیرت اور روحانی فیوض نے نہ صرف عام لوگوں کو ان کے دامنِ ارادت سے وابستہ کر رکھا تھا بلکہ والیانِ ریاست اور امراء بھی کافی تعداد میں ان کے حلقہ بگوش تھے۔ اس سلسلہ میں نواب صادق محمد خان والئی ریاست بہاولپور۔ نواب وزیر خان والئی ٹونک۔ نواب قیصر خان والئی جھجل اور نواب تنگیا خاں والئی ریاست جوٹی کے نام خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

نواب صادق محمد خان والئی بہاول پور کی خواجہ صاحب سے عقیدت کا جو حال خواجہ حسن نظامی مرحوم نے اپنے ایک مضمون میں بیان کیا ہے اسے ہم یہاں درج کر رہے ہیں۔ اس کے مطالعہ سے جہاں خواجہ صاحب کے علو مرتبہ کا پتہ چلتا ہے وہاں یہ بھی اندازہ ہوتا ہے کہ وہ کردار کے اعتبار سے کس درجہ بلند تھے۔

"میں نے حضرت خواجہ صاحب کی بارہا زیارت کی ہے اور بارہا یہ منظر اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے کہ خواجہ صاحب ایک گاڑی میں سوار ہیں جیسی بچوں کی گاڑی ہوتی ہے۔ اور نواب صاحب بہاول پور (سر صادق محمد خان ثالث مرحوم) ملازموں کی طرح اس گاڑی کو ہاتھوں سے دھکیل کر چلا رہے ہیں۔

احمد پور میں خواجہ صاحب نواب صاحب کے مہمان تھے۔ میں روز حاضر مجلس ہوتا تھا۔ باہر نوابی محل تھا۔ اندر فقیر کا بوریہ بچھا رہتا تھا اور حلقہ میں عہد گذشتہ کے اولیاء اللہ کا جلوہ نظر آتا تھا۔

برکت ان کا منظور نظر قوال تھا۔ اور اس کی ناز برداری میں خواجہ صاحب کسی کٹھ ملا کی ملامت کا خیال نہ فرماتے تھے۔

وہ بہت بھولے اور دنیا سے بے خبر معلوم ہوتے تھے۔ مگر حقیقت میں ایسا نہ تھا۔ وہ ہر دنیاوی باریکی کو جانتے تھے۔ ان کی بھولپن کی روش خود ساختہ ہوتی تھی تاکہ لوگ ان سے فائدہ اٹھائیں اور اپنی ضرورتیں پوری کریں۔ اور بھولپن کے سبب ان کو اظہار خیال میں جرأت ہو جائے۔

ان کے پاس متعدد دنیا پرست اور دھوکہ باز لوگ بھی جمع رہتے تھے جو ان کے

بھولپن سے ناجائز فائدے اٹھاتے تھے۔ ایک روز میرے والد نے خواجہ صاحب سے اس کا ذکر کیا تو متبسم ہو کر فرمایا کہ میں جانتا ہوں مگر خدا سے شرماتا ہوں۔ اس نے مجھ کو اپنی نعمت کے خزانے بغیر کسی لیاقت کے دیئے ہیں۔ میں اس کے بندوں کی لائقی و نالائقی پر غور کیوں کروں جس کا جو حصہ ہے مل جاتا ہے۔ خواہ اس کو جائز طریق سے لے یا ناجائز طریق سے۔ جائز طریق سے لے گا تو عاقبت بخیر ہوگی۔

غرض حضرت خواجہ غلام فریدؒ دورِ آخر کے ایک بے مثل بزرگ اور درحقیقت گوہرِ شب چراغ تھے۔"

خاندان و نسب

خواجہ غلام فریدؒ فاروقی النسل۔ عربی نژاد اور ولی الاصل تھے۔ آپ کے آباو اجداد، جن کا سلسلۂ نسب فاروق اعظم رضی اللہ تعالیٰ عنہٗ تک پہنچتا ہے عرب سے آئے تھے۔ یحییٰ بن مالک جو ناصر بن عبد اللہ بن عمرؓ کے پڑپوتے اور خواجہ صاحب کے مورثِ اعلیٰ تھے سب سے پہلے سندھ میں وارد ہوئے ان کی اولاد حکومت کے اعلیٰ عہدوں پر فائز رہی۔ سندھ کے لوگ ان کی انتہائی عزت و تکریم کرتے تھے اور انہیں اپنا سردار مانتے تھے۔ عیسیٰ بن یوسف جو مالک کی ساتویں پشت میں سے تھے سب سے پہلے دنیاوی جھمیلوں سے دستبردار ہوکر فقر و تجرد کی طرف مائل ہوئے۔ ان کے بعد اس خاندان کے اکثر افراد دنیا سے زیادہ دین کے دلدادہ اور روحانی قدروں کے دالا و شیدا رہے۔ انہوں نے سندھ کو ہی اپنا وطن بنا لیا اور مستقل طور پر سندھ کے زیریں علاقہ میں آباد ہو گئے۔ شیخ پریا کے بیٹے شیخ حسین کا قیام بسلسلۂ ملازمت ٹھٹھہ میں رہا۔ ان کے عہد کی اکثر عمارتوں کے کھنڈرات آج بھی یہاں موجود ہیں۔

شیخ حسین نے آخری عمر میں سرکاری ملازمت ترک کر کے فقر کا جامہ پہنا۔

اور سلسلۂ سہروردیہ سے خرقۂ خلافت حاصل کر کے خدمتِ اسلام میں مشغول ہو گئے۔ شیخ حسین کے فرزند مخدوم محمد ذکریا جو اپنے والد کی طرح سلسلۂ سہروردیہ سے منسلک تھے۔ سندھ سے ترک سکونت کر کے ملتان آ گئے جہاں سہروردیہ خانوادے کے بزرگ پہلے سے موجود تھے۔

مخدوم محمد ذکریا کے فرزند مخدوم نور محمد بھی مشہور بزرگ صوفیوں میں شمار ہوتے ہیں۔ ان کا مزار ضلع ملتان کی تحصیل لودھراں میں زیارت گاہِ عوام ہے۔ شاہجہان بادشاہ کا وزیر ارادت خان ان کا مُرید تھا۔ شاہجہان کو بھی آپ سے عقیدت تھی۔ اس نے پانچ ہزار بیگہ اراضی آپ کی خانقاہ کے اخراجات کے لئے دی ہوئی تھی۔ مناقب فریدی میں اس عطیۂ سلطانی کے متعلق شاہجہان کے فرمان کی نقل جو ۱۰۴۴ھ میں لکھا گیا تھا، درج ہے اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ بادشاہ ہند شاہجہان کے دل میں مخدوم نور محمد کی کتنی قدر و منزلت تھی۔ اس فرمان میں مخدوم صاحب کو ان القاب سے یاد کیا ہے

"کرامت نشاں۔ پیر و مرشد طریقت ہادیٔ راہِ حقیقت رہبرِ راہِ شریعت و معرفت۔ غواص بحر عرفاں۔ زبدۂ خدا پرستاں

حضرت قبلہ میاں صاحب مخدوم نور محمد کوریجہ دام اللہ ظلہٗ و شرفہٗ"

مندرجہ بالا فرمان میں مخدوم نور محمد کے نام کے ساتھ لفظ کوریجہ استعمال کیا گیا ہے جس سے یہ شبہ ہوتا ہے کہ وہ نسل کے اعتبار سے فاروقی نہیں بلکہ ہندوستان کی کسی علاقائی قوم سے تعلق رکھتے ہیں۔ لیکن حقیقت اس کے برعکس ہے۔ تاریخ مشائخ چشت میں مناقب المحبوبین کے حوالہ سے یہ حکایت درج ہے

"خواجہ صاحب کے خاندان کے ایک بزرگ ایک دن مسجد میں نماز پڑھنے
کے لئے گئے اور پوچھا کہ کیا کسی نے اذان کہہ دی ہے ؟ لوگوں نے نفی میں
جواب دیا تو آپ نے مٹی کے ایک برتن کو جو آپ کے ہاتھ میں تھا کہا "اے
کوزے تو اذان کہہ" چنانچہ کوزے نے اذان کہہ دی ۔ کوزے کو سندھی
زبان میں "کورا" کہتے ہیں اور کہنے کے لئے اس زبان میں "جو" کا لفظ
استعمال ہوتا ہے ۔ چنانچہ یہ لفظ اصل "کوراجہ" تھا جس کے معنی تھے کوزہ گو
یعنی اے کوزے تو کہہ! اور آپ کو اُسی دن سے "کوراجو" کہا جانے لگا۔ جو
رفتہ رفتہ کوریجہ بن گیا۔ اور آپ کی اولاد کو بھی کوریجہ ہی کہا گیا۔"

حدیقۃ الاسرار فی اخبار الابرار کے مصنف نے بھی اس روایت کی تائید
میں لفظ کوریجہ کو خرقِ عادت کا باعث قرار دیا ہے ۔ لیکن ہفت اقطاب
اور مناقب فریدی کے مصنف اس روایت کو نہیں مانتے ۔ وہ اس لفظ کی وجہ
تسمیہ شیخ کوریا بن بیربا کو بتاتے ہیں ۔ یہ بزرگ مالک بن یحییٰ کے خاندان میں
سے تھے جن کے نام پر اس خاندان کا نام کوریجہ مشہور ہو گیا ۔ مناقب فریدی
میں لکھا ہے کہ

"کوریجہ اصل میں "کوراجا" تھا جو "کورزا" کا سندھی تلفظ ہے ۔ اور
کورزا مرزا کی طرح ہے جس کے معنی ہیں اولاد کور"

اس توجیہہ کی صداقت کا پتہ اس بات سے بھی چلتا ہے کہ جب اس خاندان
کے بزرگوں نے حکومت کے عہدوں کو خیر باد کہہ کر سندھ میں مستقل سکونت اختیار
کر لی تھی تو وہ وہاں کی سرزمین سے اتنے مانوس ہو گئے تھے کہ انہوں نے

سندھیوں کی طرز پر اپنی اولاد کے نام بھی مالک اور یحییٰ کے بجائے شیخ پریا شیخ پنوں شیخ کور اور شیخ تار رکھ لیئے تھے۔

مخدوم نور محمد کے پوتے مخدوم محمد شریف سیت پور کے قریب یارا والی کے مقام پر لب دریائے سندھ سکونت پذیر ہوئے۔ بعد میں مٹھن خان رئیس سے جو ان کے معتقدوں میں سے تھا، کہہ کر کوٹ مٹھن کی بنیاد ڈالی اور وہیں اقامت گزیں ہو گئے۔

مخدوم محمد شریف کے دو بیٹے تھے۔ قاضی نور محمد اور قاضی محمد عاقل یہ دونوں صاحب علم اور باکرامت بزرگ گذرے ہیں۔ ان کے والد نے سلسلۂ سہروردیہ کی قوتِ عمل کو گھٹتا دیکھ کر انہیں سلسلۂ چشتیہ میں بیعت کرنے کی تلقین کی۔ چنانچہ یہ خانوادہ، چشت کے مشہور بزرگ خواجہ فخرالدین دہلوی کے خلیفہ قبلۂ عالم خواجہ نور محمد مہاروی کے مرید ہو گئے۔ انہوں نے اپنے پیر و مرشد کے ساتھ اپنے دادا پیر خواجہ فخرالدین دہلوی کی بھی زیارت کی اور ان سے فیض باطنی بھی حاصل کیا۔ قاضی محمد عاقل گاہے بگاہے دہلی جاتے رہتے تھے اور خواجہ فخرالدین دہلوی کی صحبت میں زیادہ سے زیادہ وقت گذارتے تھے۔ چونکہ خواجہ فخرالدین اکبر شاہ ثانی بہادر شاہ ظفر کے پیر ہونے کی حیثیت سے قلعۂ معلیٰ میں تشریف لے جایا کرتے تھے اس لئے انہیں کے ساتھ قاضی محمد عاقل کا بھی وہاں آنا جانا ہو گیا۔ اس آمد و رفت کے بعد بہادر شاہ ظفر قاضی محمد عاقل کی سیرت و کردار سے اتنے متاثر ہوئے کہ انہوں نے اپنے بیٹے شاہزادہ جہاں خسرو اور کاؤس شکوہ کو ان کے

ہاتھ پر بیعت کرا دیا۔

بہادر شاہ ظفر نے قاضی محمد عاقل سے اپنی محبت و عقیدت کا اظہار اپنی ایک غزل میں بھی کیا ہے۔ جس کا مطلع ہے۔

دوستی جو تجھ سے جاہل سے دلی رکھتے ہیں ہم
دشمنی اپنے مگر دل سے دلی رکھتے ہیں ہم

اس غزل کا یہ شعر ظفر کی "عاقل دوستی" کا بیّن ثبوت ہے

صحبتِ پیرِ مغاں ہم کو خوش آئی ہے بدل ؟
ہم ہیں عاقل ربط عاقل سے دلی رکھتے ہیں ہم

مقطع میں اپنے پیر خواجہ فخرالدینؒ سے عقیدت کا اظہار کیا ہے

دِل فدا کرتے ہیں نامِ فخرِ دیں پر اے ظفر
عشق اپنے پیرِ کامل سے دِلی رکھتے ہیں ہم

قاضی محمد عاقل کے بیٹے میاں احمد علی تھے جو ان کے بعد مسندِ خلافت پر بیٹھے۔ علم و فضل میں دور دور ان کی شہرت تھی۔ اور خواجہ محمد سلیمان تونسوی جیسے صاحبِ رشد و ہدایت ان کے شاگرد تھے۔ ان کے دو بیٹے تھے ایک خواجہ خدا بخشؒ اور دوسرے خواجہ تاج محمود۔ خواجہ خدا بخشؒ خواجہ غلام فریدؒ کے والد تھے۔ ان کی عمر تینتیس سال کی تھی کہ والد کا سایہ سر سے اٹھ گیا اور انہیں مسندِ ہدایت کی ذمہ داری سنبھالنی پڑی۔ ان کے متعلق فوائد فریدیہ میں قبلۂ عالم نور محمد مہاروی کی یہ پیشین گوئی درج ہے۔

"نور محمد قبلۂ عالم قبل از تولد او والدۂ شریفہ وے را فرمودہ بودند

کہ از شکم تو قطب الاقطاب مے زائد کہ ہمہ دین از و روشنی خواہد گرفت و

لقب آں حضرت محبوب الہیٰ است "

خواجہ خدا بخش جو مادرزاد ولی اور عالم باعمل تھے مخلوق کو اپنے فیوض و برکات سے فیض یاب کرتے رہے کہتے ہیں کہ ان کا لنگر اتنا وسیع تھا کہ صرف مہمانوں کے گھوڑوں کے لیے بارہ من غلہ روزانہ صرف میں آتا تھا۔ بعد میں خواجہ صاحب سکھوں کے مظالم سے تنگ آکر کوٹ مٹھن کو ترک کر کے سابق ریاست بہاولپور کی تحصیل خانپور میں چاچڑاں کے مقام پر ہجرت کر گئے تھے۔ اس تبدیلی سکونت میں نواب صادق محمد خان اول کی خواہش کو بڑا دخل تھا جو ان سے بے پناہ عقیدت رکھتے تھے۔ کہتے ہیں کہ اسی عقیدت کے تحت نواب صاحب نے خواجہ صاحب کے لنگر کے خرچ کے لیے کچھ مواضعات پیش کیے تھے لیکن انہوں نے یہ کہکر اس پیش کش کو مسترد کر دیا کہ میرے بزرگوں نے کبھی کوئی ایسی چیز قبول نہیں کی جس سے فقیری متاثر ہو۔ وہ فرماتے تھے کہ زمینداری کی صورت میں مال گذاری واجب ہو گی اور جب مال گذاری کی ادائیگی میں کبھی دقت پیش آئے گی تو عدالت کا منہ بھی دیکھنا پڑے گا۔ جو فقیروں کے مشرب کے خلاف ہے۔

مولانا خدا بخش کا انتقال ہوا تو خواجہ غلام فریدؒ کی عمر ۸ سال کی تھی۔ البتہ ان کے بڑے بھائی مولانا غلام فخرالدین جوان تھے چنانچہ انہی کو مسندِ خلافت ملی مولانا فخرالدین جن کا نام فخرِ جہاں فخرالدین دہلوی کے نام پر رکھا گیا تھا۔ اپنے دادا کے تربیت یافتہ تھے۔ انہوں نے بھی اپنے والد کے نقشِ قدم پہ چلتے ہوئے رشد

ہدایت کا سلسلہ جاری رکھا۔ وہ نماز روزے کے پابند اور زہد واتقا کی منہ بولتی تصویر تھے کہتے ہیں تمام زندگی میں انکی صرف تین نمازیں قضا ہوئیں۔ وہ سماع کی محفلیں بھی منعقد کرتے تھے لیکن ان میں صرف انہی لوگوں کو شرکت کی اجازت تھی جو اہلِ دل اور صاحب سوز و درد ہوں۔ نواب بہاولپور نے انہیں اس پیشکش کو قبول کرنے پر آمادہ کر لیا تھا۔ جسے ان کے والد نے شانِ فقر کے خلاف سمجھتے ہوئے منظور نہیں کیا تھا یہ پیشکش کئی مربعہ اراضی پر مشتمل تھی اور اس سے ان کے لنگر کے اخراجات پورے کئے جاتے تھے۔

خواجہ فخر الدین شاعر بھی تھے اور اوحدی تخلص کرتے تھے۔ ان کا کلام جو فارسی میں تھا۔ اب کہیں دستیاب نہیں ہوتا۔

انہوں نے ۴۰ سال کی عمر میں وفات پائی اور خواجہ غلام فرید ان کے جانشین قرار پائے۔

خواجہ صاحب کی زندگی

خواجہ صاحب کا نام ان کے والد نے شیخ فرید الدین گنج شکر رحمۃ اللہ علیہ کے نام پہ غلام فرید رکھا تھا اور یہ شاید اسی نام کا اثر تھا کہ وہ عرفان و شعر کے بلند مقام پہ پہنچے۔ بابا فرید اور خواجہ فرید کے زمانے میں تقریباً سات سو سال کا فاصلہ ہے۔ لیکن یہ بعد روحانی دنیا میں کیا حقیقت رکھتا ہے۔ چنانچہ خواجہ صاحب پہ اپنے ہمنام ولی کا عکس اس طرح پڑا جیسے آفتاب اپنی ہزاروں میل کی بلندی سے بھی دنیا کے تاریک سے تاریک گوشے کو منور کر دیتا ہے۔ بابا فرید نے ملتانی زبان کی شاعری کا جو چراغ پہلے پہل روشن کیا تھا۔ اسے خواجہ غلام فرید نے نہ صرف روشن کئے رکھا بلکہ فریدی تصرفات کے سوز سے اس کی تابانی میں بے حساب اضافہ کیا۔

پیدائش خواجہ صاحب کا تاریخی نام "خورشید عالم" ہے جس سے سن ہجری کے ۱۲۶۱ عدد نکلتے ہیں۔ لیکن جہاں تک دن اور ماہ کا تعلق ہے اس میں قدرے اختلاف پایا جاتا ہے۔ گوہر شب چراغ کے مصنف محمد انور فیروز ۲۶ ذیقعد بتلاتے ہیں۔ اور مولوی رکن الدین مرتب مقابیس المجالس ماہ ذی الحجہ کے آخری

سہ شنبہ کو ولادت کی صحیح تاریخ اور دن قرار دیتے ہیں۔ انہوں نے لکھا ہے۔

"ولادت باسعادت حضرت قطب العالم غوثِ اعظم فرد انجم حضور خواجہ غلام فرید ثانی رضی اللہ تعالیٰ در روز سہ شنبہ پیش از طلوع آفتاب در ساعت مشتری در عشرۂ آخریہ از ماہ ذی الحجہ ۱۲۶۱ھ واقع شدہ است۔

مقابیس المجالس کا یہ اندراج زیادہ تفصیلی ہونے کی وجہ سے درتیح تر ہے مزید برآں چونکہ مولوی رکن الدین خواجہ صاحب کے پاس آنے جانے والوں میں سے تھے اس لئے ان کے بیان کی صداقت پر شک و شبہ کی گنجائش نہیں۔ اس حساب سے خواجہ غلام فرید ماہ ذی الحجہ ۱۲۶۱ھ کے آخری سہ شنبہ کو طلوع آفتاب سے پہلے چاچڑاں کے مقام پر پیدا ہوئے۔

ان کی پیدائش پر مختلف شعراء نے بہ نظرِ عقیدت و مسرت اشعار کہے اور ان کے والد خواجہ خدا بخش کی خدمت میں پیش کیے۔ ایک قصیدے کا یہ شعر مناقب فریدی میں درج ہے۔

زہے گوہر خاندانے فرید — درے یا مے قدر و عمرش مزید

قطب الاقطاب میں بھی خان بیلہ کے ایک شاعر مولانا محمد عثمان کے یہ شعر ملتے ہیں۔

شکر للہ کہ گوہر والا — از خدا بخش شد غلام فرید
دوش برگوش من سروش خروش — منتظم داد عقد مروارید
طول اللہ عمرہ طرا — جعلہ اللہ کالفرید نقید

پرورش خواجہ صاحب چار برس کے تھے کہ والدہ کی آغوشِ محبت سے محروم ہو گئے۔ آٹھ برس کی عمر میں والد کا سایہ بھی سر سے اُٹھ گیا۔ چنانچہ ان کی پرورش ان کے بڑے بھائی خواجہ غلام فخرالدین نے اپنے ذمہ لی وہ لاولد تھے اس لئے انہوں نے حقیقی اولاد کی طرح انہیں پالا پوسا۔ ان کے ماموں ملک غلام محمد بھی جو ڈیرہ غازی خان کے رئیسوں میں سے تھے ان کا ہر طرح خیال رکھتے تھے۔ کچھ دن بعد نواب صادق محمد خان نے خواہش ظاہر کی کہ ان کی پرورش کا فرض انہیں سونپ دیا جائے۔ چنانچہ وہ مولانا فخرالدین کی اجازت سے محل میں منتقل ہو گئے اور نواب زادوں کی طرح وہاں ہاتھوں چھاؤں رہے۔ یہاں ان کے ماموں ملک غلام محمد اور ان کے استاد مولانا قائم الدین بھی ان کے ہمراہ رہے تاکہ ان کی دلبستگی اور تعلیم و تربیت میں فرق نہ آنے پائے۔

رسم بسم اللہ خواجہ صاحب کی رسم بسم اللہ کا واقعہ بڑا دلچسپ ہے کہتے ہیں جب خواجہ صاحب کی عمر ساڑھے تین سال کی ہوئی تو ان کے بڑے بھائی مولانا فخرالدین نے کہا کہ غلام فرید کی ختنہ اور بسم اللہ ایک ساتھ ہی ہو جائیں۔ چونکہ خواجہ صاحب کی زبان اتنی کم عمر میں ہی چل پڑی تھی اس لئے سب نے اس تجویز کو پسند کیا۔ اس وقت خواجہ صاحب کے والد مولانا خدا بخش بھی بقیدِ حیات تھے انہوں نے اپنے چھوٹے بھائی مولانا تاج محمود سے کہا کہ وہ فرید کی بسم اللہ پڑھا دیں۔ چنانچہ جب مولانا تاج محمود نے انہیں اپنے سامنے بٹھا کر ان کی انگلی الف پر رکھی اور کہا "آکھ غلام فرید الف"

تو خواجہ صاحب نے بعینہٖ اس فقرے کو دہرا دیا۔ اب بار بار مولانا تاج محمود کہیں "آکھ غلام فرید الف" اور خواجہ صاحب بھی کہدیں آکھ غلام فرید الف" اس فقرے کی تکرار نے مولانا تاج محمود پر وجد کا عالم طاری کر دیا۔ وہ بار بار اپنے زانو پر ہاتھ مارتے اور کہتے "آکھ غلام فرید الف" حاضرین محفل نے اس فقرے کی بناوٹ پر غور کیا تو انہیں پتہ چلا کہ یہ ایک مصرعہ موزوں ہے۔ مولانا خدا بخش نے قوالوں کو اشارہ کر دیا۔

قوالوں نے یہ مصرعہ اٹھایا تو ساری محفل پر حال طاری ہو گیا۔

خواجہ صاحب کی ایک کافی جس کا مصرعہ یہ ہے

ہکو الف ہم بس وے میاں جی

اسی واقعہ کی طرف اشارہ کرتی ہے۔ اس میں خواجہ نے "الف" سے اپنی قدیم دل گرفتگی کو بڑے ذوق و شوق کے ساتھ بیان کیا ہے خواجہ صاحب چونکہ مادر زاد ولی اور پیدائشی شاعر تھے اس لئے "الف" جو اللہ کا مظہر ہے اس پر وہ آنکھ کھولتے ہی فدا ہو گئے اور ان کی زبان آغاز تعلیم میں جس فقرے سے آشنا ہوئی وہ مصرعۂ موزوں تھا۔

تعلیم و تربیت خواجہ صاحب ۱۶ سال کی عمر تک تحصیل علوم میں مصروف رہے۔ اس کے بعد باطنی علوم کی طرف متوجہ ہوئے اور اپنے بڑے بھائی مولانا فخر الدین سے جن کے ہاتھ پر ۱۳ سال کی عمر میں بیعت کی تھی۔ روحانی تربیت حاصل کی۔ مولانا فخر الدین خواجہ فرید کو اولاد کی طرح چاہتے تھے۔ انہوں نے ان کی تربیت کا پورا پورا حق ادا کیا اور طریقت کے جملہ اسرار و رموز جو ایک سالکِ راہِ حقیقت کے

لئے ضروری ہوتے ہیں انہیں بتائے ۔ بھائی کی اس نظرِ خاص کا یہ نتیجہ ہوا
کہ خواجہ غلام فرید بہت جلد ظاہری و باطنی علوم سے بہرہ ور ہو گئے ۔ اور
دوسرے طالبانِ حق ان سے معرفت کا درس لینے لگے ۔

خواجہ صاحب کو اپنے بھائی سے ایک سچے مرید کی طرح والہانہ محبت
تھی ۔ مولانا اختر صاحب جو خواجہ صاحب کے خاص مصاحبوں میں سے
تھے اس تعلق کے سلسلہ میں لکھتے ہیں ۔

"یہ (خواجہ غلام فرید) اپنے پیر اور بھائی کے عشق میں اس قدر محو
اور مستغرق تھے کہ تمام عشاق کے قصص اس داستانِ عشق کے سامنے
ہیچ معلوم ہوتے ہیں ۔ یہ فنا فی الشیخ کے درجے میں پہنچ گئے تھے ۔"

خواجہ فرید نے اپنی کافیوں میں جگہ جگہ اس محبت و عقیدت کا اظہار کیا
ہے ایک جگہ کہتے ہیں

چشماں فخر الدین مٹھل دیاں   تن من کیتا چکنا چور
گھول گھتاں میں فخر جہاں توں   جنت حور قصور

خواجہ صاحب بڑے ذہین اور طباع تھے ۔ انہوں نے آٹھ سال کی عمر
میں قرآن مجید حفظ کیا اور اس کے تھوڑے ہی عرصے بعد درس نظامی کی
تکمیل کر لی ۔ حدیث ۔ تفسیر ۔ فقہ اور دیگر علوم انہوں نے باقاعدہ حاصل
کئے ۔

مولانا بشیر اختر خواجہ صاحب کے تبحر علمی کے متعلق اپنی کتاب
فقرِ فرید میں لکھتے ہیں کہ

"عوارف المعارف۔ احیاء العلوم۔ کیمیائے سعادت۔ سہ مراتب تحفۂ مرسلہ۔ لوائح شریف۔ فصوص الحکم۔ جواہر جلالی۔ جامع العلوم کشکول حکمی۔ جیسی اونچی کتابیں آپ کے مطالعہ میں رہتیں اور ان کے خواص بیان کرتے وقت علمائے عصر کو دنگ کر دیتے۔"

خواجہ صاحب کے علمی پایہ کے بیان میں بشیر اختر صاحب نے یہ روایت بھی نقل کی ہے

"مولانا شاکر محمد صاحب دیردی جو اپنے وقت کے جلیل القدر عالم تھے۔ حضرت فرید رحمتہ اللہ علیہ کے ہاں رہ کر استفادہ علمی کرنے لگے تو کسی نے مولانا سے پوچھا کہ آپ نے حضرت فرید سے کیا کچھ حاصل کیا ہے تو مولانا نے فرمایا کہ ابھی تک صرف لا الہ کے معنی ہی ختم نہیں ہوئے"

اس روایت سے جہاں خواجہ صاحب کی منزلتِ علم کا پتہ چلتا ہے وہاں عرفان و آگہی کی ان منزلوں کی نشاندہی بھی ہوتی ہے۔ جنہیں خواجہ صاحب طے کر چکے تھے۔ وہ نہایت دقیقہ رس اور معنی آفریں دماغ قدرت سے لے کر آئے تھے۔ جو باتیں بظاہر بڑی معمولی ہوتی ہیں۔ جب وہ اُن پر اظہار خیالات کرتے تو معلومات کا دفتر کھول کر رکھ دیتے اور ایسے ایسے نکتے پیدا کرتے کہ عقل دنگ ہو کر رہ جاتی تھی مولوی غلام احمد اختر لکھتے ہیں۔

"ایک دفعہ دورانِ سفر میں آپ مجھ سے مخاطب تھے۔ صبح کا

وقت تھا اور آفتاب اپنی پوری آن بان سے طلوع ہو رہا تھا۔ توجہ بار بار اس خوبصورت نظارے کی طرف منعطف ہو جاتی۔ اس پر حضور سے ارشاد ہوا کہ کیا دیکھ رہے ہو۔ عرض کی کہ مہر عالمتاب کا شاندار جلوہ اس سہانے وقت میں بھلا معلوم ہو رہا ہے۔ فرمانے لگے کہ بس اسی پر لٹو ہو ارض فطرت تو کہیں زیادہ وسیع اور خوبصورت ہے۔ اس پر ایک ایسی پر معنی اور مطلب خیز تقریر فرمائی کہ اللہ اللہ ۲۲ گھنٹے کا مل ہونے کو آئے مگر معلومات کا سلسلہ کہیں ختم ہونے میں نہ آتا تھا۔ برابر بولے چلے جاتے تھے اور تھکان کا نام تک نہ لیتے تھے۔ منزلِ مقصود پر ایک بار کسی جاں نثار نے ازراہِ اخلاص کھانا کھانے کے بہانے سے مجھے علیحدہ کرنا چاہا مگر آپ نے منظور نہ فرمایا اور سلسلہ کلام جاری رکھ کر اسی ایک موضوع پر مستفید فرماتے چلے گئے۔ اللہ اکبر ایک انسانی چھوٹا سا دماغ اور اس میں اتنا بڑا گنج معانی۔ اختر کو اعتراف ہے کہ لیاقت کا کبھی اسے بھی گھمنڈ تھا مگر آنحضرت کو سن سنا کر آج اتنی کرکری ہوئی کہ طفلِ دبستان سے بھی اپنے آپ کو کم جانا"

خواجہ صاحب نے علوم دینیہ کے ساتھ ساتھ دوسرے علوم مثلاً تاریخ۔ جغرافیہ کا بھی مطالعہ کیا تھا اور اس باب میں ان کی نظر بڑی دقیقہ رس تھی۔ مقابیس المجالس کی ایک روایت کے مطابق ایک بار سیستانی اور سیویستانی دو لفظ معرضِ بحث میں آئے۔ عام طور پر لوگوں کا خیال تھا

کہ ایک ہی لفظ کی دو مختلف صورتیں ہیں۔ لیکن خواجہ صاحب نے بتایا کہ سیوستان سیستان سے علیحدہ جگہ ہے اور وہ وہی جگہ ہے جسے آج کل سیوی ڈھاڈھر کہتے ہیں۔ انہوں نے مزید بتایا کہ شیخ الاسلام گنج شکرؒ کے خلیفہ شیخ عارف سیوستانی ہیں اور میر بالا پیر لاہوری کے پیر شیخ خضر بھی سیوستانی تھے۔ دورانِ گفتگو کسی نے کہا کہ سیوی ڈھاڈھر میں ایک پرانی مسجد ہے جسے مسجد علی کہتے ہیں۔ اور یہ مشہور ہے۔ کہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ وہاں تشریف لائے تھے۔ ایک اور صاحب نے کہا کہ اس پہاڑ میں بہت سے آثار ایسے ہیں جو صحابہ کرام کی طرف منسوب کئے جاتے ہیں۔ اس پر خواجہ صاحب نے جو جواب دیا۔ وہ مندرجہ ذیل اقتباس میں ملاحظہ کیجئے:۔

"حضور خواجہ ابقاہ اللہ تعالیٰ فرمودند کہ قدوم و تشریف آوردن اصحاب کرام رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم در بلاد ما و آنرو آب در جبال کہ در نظرمے آیند ثابت نشدہ است بعد ازاں فرمودند کہ اگر مسلماناں پرسیدہ شود گویند اثر پائے مبارک حضرت علی است و اینجا فلاں فلاں صحابی رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم نماز گزاردہ اند و اینجا چار یاران حضرت مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم آمدہ اند و نشستہ اند و اگر از ہندواں پرسی اوشاں بہ بزرگان خود منسوب می سازند۔ چنانچہ برکاک ندی جائے ست کہ آنجا چشمہ آب است۔ بغایت خورد و اندک مع ہذا اگر ہزار ہا اشتران ازاں آب نوشند خشک نہ شود۔ پس

ہندوان گویند اینک اثر استدراج بھگت کبیر و مسلمانان گویند کہ ایں نشان کرامت چہار یار است۔" (مقابیس المجالس صفحہ ۱۶/۲ ج)

مندرجہ بالا اقتباس کو علم کی روشنی کا ہی نتیجہ کہا جا سکتا ہے۔ وہ روایتی صوفیوں کی طرح ضعیف الاعتقاد نہ تھے بلکہ مسائل کو حقیقت بیں نگاہ سے دیکھ کر کوئی رائے قائم کرتے تھے۔

خواجہ صاحب کو تحقیق اور ریسرچ کا بڑا شوق تھا۔ تاریخی مقامات پر جانا اور ان کے متعلق تفصیلی معلومات حاصل کرنا ان کا دل پسند مشغلہ تھا۔ ایک دفعہ آپ ملتان میں شاہ رکن عالم کے مزار کی زیارت کو گئے تو کہنے لگے کہ ہندوستان میں صرف دو روضے بلند ترین ہیں ایک سید محمد گیسو دراز کا اور دوسرا شاہ رکن عالم کا۔ اس روضے کے متعلق عوام میں یہ مشہور تھا کہ شاہ رکن عالم کو حضرت غوث کے پائینتوں دفن کیا گیا تھا لیکن اگلے دن دیکھا تو وہ محمد تغلق شاہ کے مجوزہ روضے میں موجود تھے۔ خواجہ صاحب نے اس خوش فہمی کو تاریخی واقعہ سے رد کیا۔ چنانچہ مقابیس المجالس میں درج ہے۔

"اندریں اثناء ایں بندہ راقم الحروف عرض کرد آنچہ در مردم عوام مشہور است کہ چوں شاہ رکن العالمؒ را در پائیں مزار حضرت غوث صاحب دفن کردند شب گذشتہ و فردا باز دیدند کہ آنجا مغاک شدہ بود صندوق و مزار مبارک ایشاں در روضۂ بادشاہ برآمدہ موجود بود پس ایں نقل چگونہ است۔ حضور فرمودند ایں غلط است

حقیقتِ حال این است کہ چوں شاہ رکن العالم را آنجا دفن کردند حضرت غوث الاعظم یکے را در رویا پا واقعہ چنانچہ از مشائخ بیباشد فرمودند تا کہ شاہ رکن العالم را از پائین دفن کردہ: ایدمن پائے فرود آوردہ ام بعد ازاں آنجا صندوق ایشاں برآوردہ دریں روضۂ بادشاہ دفن کردند و مزار ساختند۔ بادشاہ محمد تغلق فیروز ہندوستان فوت شدہ بود او را در آنجا دفن کردند پس ایں روضہ کہ وے برائے خود بنا۔ کردہ بود خالی افتادہ بود مدفن شاہ رکن عالم گردید“۔

خواجہ صاحب کو علم الانساب سے بھی بڑا شغف تھا کہتے ہیں کہ ان کے سامنے جب کسی بزرگ کا ذکر آتا تو وہ ان کے نسب کے متعلق اس طرح تفصیلات بتاتے گویا کتاب کا کوئی صفحہ پڑھ کر سنا رہے ہیں۔ مثال کے طور پر مقابیس المجالس کا یہ اندراج ملاحظہ ہو۔

" سخن در ذکر سادات کرام مے رفت۔ حضور خواجہ ابقاہ اللہ تعالیٰ فرمودند کہ سادات مودودیہ یعنی اولاد حضرت خواجہ مودود چشتی، رضی اللہ تعالیٰ عنہ کہ یکے از پیرانِ عظام ہستند بسیار و بے شمار اند کہ تمام خراساں از سادات مودودیہ و مریدان ایشاں پر شدہ است واں طرف کوہستان مثل تلات وغیرہ نیز ہمہ از سادات مودودیہ و مریدان ایشاں آباداں و معمور است و در ہندوستان ہم مودودیہ، بسیار اند آنگاہ فرمودند کہ خود آنحضرت خواجہ مودود چشتی از

اولاد امام حسن عسکری صاحب اند؟ حضور خواجہ القاہ اللہ تعالے فرمودند کہ آرے حضرت ایشاں صحیح النسب بخاری اند و با حضرت سید جلال الدین بخاری خویشگی و قرابتے قریب مے دارند چنانچہ حضرت سلطان المشائخ محبوب الٰہی خواجہ نظام الدین بن حضرت سید احمد ابن حضرت سید علی اند و والدہ حضرت سلطان المشائخ بی بی زلیخا بنت حضرت سید عرب بود و حضرت سید علی و سید عرب ہردو برادر حقیقی بودند وایں ہردو برادران بسبب حوادث روزگار از بخارا شریف ہجرت کردہ رخت رحلت بستہ در ہندوستان اقامت ورزیدہ اند و توطن گزیدہ پس نام نامی پدر عالی قدر حضرت مخدوم سید جلال الدین بخاری اوچی نیز سید علی است و پدر بزرگوار ابن سید علی و پدر عالی گوہر حضرت سید علی و حضرت سید عرب کہ از اجداد حضور حضرت سلطان المشائخ ہستند برادر عم زادہ یک دیگر بودند"

مقابیس المجالس میں خواجہ صاحب کی علمی بصیرت کی بھی بہت سی مثالیں درج ہیں۔ ایک جگہ لکھا ہے کہ ایک بار درگاہ موسیٰ پاک کے سجادہ نشین مخدوم صدر الدین نے شیخ عبدالقادر جیلانی کے اس قول کی تشریح پوچھی

قَدَمِی ھٰذِہٖ علیٰ رقبۃ کل ولی اللہ

بعض علماء کی رائے تھی کہ اس مقولہ کی رُو سے تمام اولیائے متقدمین و متاخرین (جن میں صحابہ بھی شامل ہیں) کی گردنیں شیخ عبدالقادر جیلانی

کے قدموں میں جھکی ہوئی ہیں (نعوذ باللہ) خواجہ صاحب نے اس ملفوظے کی تردید میں زور کلام سے زیادہ دلائل سے کام لیا۔ نفحات الانس۔ اخبار الاخیار اور مکتوب امام ربانی میں سے عبارتیں پڑھ کر سنائیں اور یہ ثابت کیا۔ کہ اس فقرے میں اولیاء سے مراد اولیائے وقت ہیں جو شیخ عبدالقادر جیلانی کے عہد میں موجود تھے۔

خواجہ صاحب تحصیل علم کے معاملہ میں تعصبات سے بالکل آزاد تھے۔ انہوں نے جہاں عربی و فارسی دینی علوم کی غرض سے پڑھی تھیں۔ وہاں اردو ہندی، سندھی اور پوربی زبانیں بھی سیکھی تھیں تاکہ ان زبانوں کے علمی و ادبی سرمایہ سے استفادہ کر سکیں۔ ان کا خیال تھا کہ انسان کو اپنا دامن وسیع رکھنا چاہیئے۔ اسی جذبہ کے تحت انہیں انگریزی زبان سیکھنے کا بھی خیال پیدا ہوا۔ حالانکہ وہ زمانہ انگریز دشمنی کے عروج کا تھا۔ لیکن انہوں نے اس مخالفت کی پروا نہ کرتے ہوئے انگریزی کی ابجد پڑھی اور رومن لکھنے کی مشق کی۔ مولانا عبدالرشید نسیمؒ ایک مضمون میں لکھتے ہیں:۔

"۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے بعد کا زمانہ تعصب و تنگ نظری کیلئے مشہور ہے۔ خصوصاً انگریز دشمنی کے ساتھ ساتھ انگریزی زبان اور انگریزی علوم کے ساتھ دشمنی بھی زوروں پر تھی۔ مگر خواجہ صاحب پر اس کا کچھ بھی اثر نہ تھا۔ آپ نے انگریزی ابجد سیکھنے اور رومن لکھنے کی کافی مشق کی تھی اور اس بات کو علی الاعلان بیان

فرماتے بلکہ حاضرین میں سے جو رومن لکھنا جانتے ان سے مقابلہ کرتے
اور اس اظہار میں قطعاً کوئی عار یا شرم محسوس نہ کرتے تھے۔"
اسی سلسلہ میں مقابیس المجالس کا یہ اقتباس بھی خالی از دلچسپی نہ ہوگا
"واندریں اثنا بسوئے میاں صاحب میاں فضل حق صاحب منگیروی
روئے آوردہ فرمودند کہ تو چگونہ خط وکتابت انگریزی قلم نوشتن
آموختی وے چنانچہ آموختہ بود عرض کرد آنگاہ ارشاد فرمودند کہ
اکنوں ہم بنویس پس وے چند سطر بحروف انگریزی نوشتہ پیش
بحضور کرد حضور آں را خواندہ فرمودند کہ ایں بیت نوشتی ؎

آرزو دارم کہ خاکِ آں قدم
توتیائے چشم سازم دم بدم

بعد ازاں حضور خواجہ ابقاہ اللہ تعالیٰ بتقاضہ لبحہ مبارک را نہادہ خود
بدولت نوشتہ میاں صاحب موصوف را دادند وے برخواند و
عرض کرد کہ قبلہ ایں بیت نوشتہ اید ؎

آنانکہ خاک را بہ نظر کیمیا کنند
سگ را ولی کنند و مگس را ہما کنند

حضور خواجہ ابقاہ اللہ تعالیٰ مسرور شدند......"
مندرجہ بالا واقعات اس بات کا بیّن ثبوت ہیں کہ خواجہ صاحب محض
تعویذ گنڈوں والے پیر یا حال کھیلنے والے صوفیوں میں سے نہ تھے بلکہ انکی
پیری اور تصوف کی پشت پر علوم متداولہ کی وہ طاقت بھی تھی جسے انہوں نے

محنت شاقہ کے بعد حاصل کیا تھا۔

سجادہ نشینی خواجہ صاحب اپنے بڑے بھائی مولانا غلام فخرالدین کی وفات کے بعد ۱۲۸۸ھ میں مسندِ ارشاد پر متمکن ہوئے۔ اس وقت ان کی عمر تقریباً ۲۸ سال کی تھی لیکن علم و عرفان کی وہ تمام منزلیں جو ایک پیر کامل کے لئے ضروری ہوتی ہیں اس سے قبل ہی طے کر چکے تھے۔

مسند نشینی کے موقع پر نواب صادق محمد خان رابع نے چاچڑاں پہنچ کر آپ کی رسم دستار بندی ادا کی اور خلعتِ فاخرہ پیش کیا۔

خواجہ صاحب کا حلقۂ ارادت چند دنوں میں ہی بہت وسیع ہو گیا دور دور سے لوگوں نے آکر ان کے ہاتھ پر بیعت کرنی شروع کر دی رؤساء اور امراء بھی کافی تعداد میں اُن کے مرید ہوئے۔ خود نواب صادق محمد خان رابع جن کی خاندانی ارادت کا سلسلہ پہلے خواجہ محمد سلیمان تونسوی اور ان کے جانشینوں سے وابستہ تھا۔ خواجہ غلام فرید کی شخصیت سے متاثر ہو کر ان کے ہاتھ پر بیعت کے طلبگار ہوئے۔ اس بیعت کا حال مولینا عزیز الرحمٰن عزیز نے اپنے ایک مضمون میں اسطرح درج کیا ہے۔

"گیارہویں محرم کو جو بیعت کا دن قرار پایا تھا۔ نواب صاحب معہ اپنے سٹاف کے حضرت خواجہ صاحب کی فرودگاہ پر پہنچے حضرت نے تا لبِ فرش، استقبال کیا، اس وقت جو ہزاروں خوانچے مٹھائی اور میوے نذر کے لئے ہمراہ تھے حضرت کی خدمت میں پیش ... ...

کیے گئے۔ اس کے بعد نواب صاحب نے نہایت انکسار سے بیعت کی استدعا کی۔ حضرت خواجہ صاحب کے اشارے پر سب حاضرین اس مقام سے اٹھ کھڑے ہوئے۔ کمرہ خالی ہوگیا۔ دروازہ بند کر دیا گیا۔ اور حضرت خواجہ صاحب نے نواب صاحب کو اپنے مقابل زانو سے زانو ملا کر بٹھایا۔ اس وقت عجیب عالم تھا۔ نواب صاحب اور حضرت خواجہ صاحب دونوں خاموش سر جھکائے بیٹھے تھے۔ منہ سے کوئی بات نہ نکلتی تھی۔ مگر ایک بجلی تھی جو عالم روحانیات سے گزر کر ایک جسم میں اترتی تھی اور وہاں سے تڑپ کر دوسرے جسم میں تیر جاتی تھی اور دل و دماغ کو تجلیات ربانی میں غوطہ دے کر نکل جاتی تھی۔ دیر تک یہی کیفیت طاری رہی۔ نواب صاحب پر اس وقت عجیب کیف اور جلال کا رنگ چھایا ہوا تھا۔ بدن کے تمام اعضاء لرز رہے تھے۔ شریانوں میں تڑپ تھی۔ خون غیر معمولی تیزی سے چکر کھا رہا تھا۔ آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گر رہے تھے۔ روح عالم بالا کی سیر میں مشغول تھی۔ باطنی حواس کی رفتار میں سرعت آگئی تھی۔ روحانی قوتیں حیرت اور محویت کے سمندر میں ڈوب گئی تھیں۔ کامل ایک گھنٹہ کے بعد نواب صاحب اس حالت سے فارغ ہوئے اور انہوں نے جھک کر اپنے مرشدِ روحانی کے قدم چوم لیے۔"

یہ اقتباس مولانا عزیز الرحمٰن کے حسنِ تحریر کا کتنا ہی اعجاز سہی لیکن

یہ حقیقت مسلّم ہے کہ نواب بہاولپور کو خواجہ صاحب سے بے حد عقیدت تھی۔ انہوں نے ایک گرانقدر جاگیر چاچڑاں شریف کی خانقاہ کے لیئے وقف کر رکھی تھی۔ اس کے علاوہ جب بھی نواب صاحب خواجہ صاحب کی زیارت کے لیئے جاتے کئی کئی ہزار روپے بطور نذر ان کی خدمت میں پیش کرتے تھے ۔ صاحب مناقب فریدی مرزا اختر گورگانی جو بہادر شاہ ظفر کے پوتے اور خواجہ صاحب کے خلفاء میں سے تھے لکھتے ہیں۔

"جو ارادت ۔ عقیدت و ادب نواب صاحب بہاولپور کو حضرت خواجہ صاحب کی نسبت ہے وہ شاید ہی کسی مرید کو اپنے پیر کے ساتھ ہوگا"

اس عقیدت کا اندازہ خواجہ حسن نظامی کے اس نوٹ سے بھی ہو سکتا ہے جس میں انہوں نے لکھا ہے کہ نواب بہاولپور خواجہ غلام فریدؒ کی گاڑی کو ملازموں کی طرح ہاتھ سے دھکیل کر چلا رہے تھے۔ ظاہر ہے جب عقیدت میں جوش اور محبت میں فراوانی ہوتی ہے تو آقا بھی غلاموں کی صف میں شامل ہونے پہ فخر محسوس کرنے لگتے ہیں۔ نواب بہاولپور کی اسی والہانہ عقیدت کا یہ نتیجہ تھا کہ خواجہ صاحب بھی اپنی تمام درویشی اور فقیری کے باوجود نوابی محل کو اکثر و بیشتر اپنے قدموں سے سرفراز فرماتے رہتے تھے۔

طبعی طور پہ امارت و ثروت خواجہ صاحب کو پسند نہ تھی۔ وہ ایسے

لوگوں کو بھی اپنے حلقۂ ارادت میں شامل ہونے کی اجازت نہ دیتے تھے جو اپنی دولت کو حصول معرفت کا ذریعہ بنانا چاہتے تھے۔ انہوں نے دکن کے ایسے کئی رئیسوں کی استدعا بھی قبول نہ کی جو خواجہ صاحب کو اپنے ہاں بُلا کر ان کے ہاتھ پر بیعت کرنے کی خواہش رکھتے تھے۔ وہ ایک خود دار انسان اور بے طمع صوفی تھے انہیں نہ مال و متاع سے غرض تھی اور نہ عز و جاہ کی پروا۔ جو شخص خلوص نیت اور ظاہری نمائش کے بغیر ان سے رشد و ہدایت کی تمنا کرتا وہ اسے مایوس نہ کرتے تھے۔ ان میں خواہ کوئی سرمایہ دار ہو یا غریب و مفلس۔

مریدوں کی تربیت

خواجہ صاحب بزرگانِ چشتیہ کے مخصوص طریقے کے مطابق مرید ہونے والے کو روبرو بٹھا کر پہلے مراقبہ کرتے۔ پھر سورۂ اخلاص پڑھتے۔ اور اس کے بعد مرید کے دونوں ہاتھوں کو اپنے ہاتھ میں لے کر اس سے کلمہ شریف پڑھواتے۔ پھر تین بار توبہ کرواتے اور نماز کی تاکید کر کے مختلف ورد و وظائف بتایا کرتے تھے۔

اشارات فریدی میں خواجہ صاحب کے بیعت کرنے کا یہ طریقہ بھی درج ہے کہ وہ اپنا رومال بچھا کر مرید ہونے والوں کو فرماتے کہ اسے پکڑ کر خاموش ہو بیٹھو۔ پھر رومال کا ایک کنارہ اپنے ہاتھ میں لے کر سر بگریباں مراقبہ فرماتے۔ بعد ازاں فرداً فرداً ہر ایک سے تین بار توبہ کرواتے اور نماز کی تاکید کرتے۔ عورتوں کو بیعت کرنے کا طریقہ

بھی یہی تھا۔ البتہ مردوں کی نسبت عورتوں کو نماز کی تاکید زیادہ کرتے تھے۔ اشارات فریدی میں لکھا ہے کہ نابالغ لڑکوں کو بیعت تو عام طریقے سے ہی کرتے تھے البتہ ان سے توبہ کا اقرار لیتے تھے نہ وظیفہ بتاتے تھے۔ کہتے ہیں کہ ایک دفعہ بہت سے لوگ مرید ہونے کے لئے آئے۔ آپ نے ایک چادر دونوں ہاتھوں میں لے کر پہلے کچھ دیر مراقبہ کیا پھر چادر خادم کو دے کر کہا کہ مرید ہونے والوں سے کہو کہ اسے چھوئیں مگر یہ احتیاط رہے کہ چادر کھلنے نہ پائے اقرار توبہ وغیرہ بھی اسی خادم کی معرفت کرایا گیا۔

چونکہ خواجہ صاحب کے مرید سارے ہندوستان میں پھیلے ہوئے تھے اس لئے وہ ہندوستان کے مختلف حصوں میں اکثر دورے پر جایا کرتے تھے۔ ہر دورے میں ان کے مریدوں کا ایک ہجوم بھی ان کے ساتھ ہوا کرتا تھا۔ جنہیں قدم قدم پر خواجہ صاحب کے روحانی و باطنی علوم سے فیضیاب ہونے کے مواقع ملتے تھے۔ مولانا اختر اپنے ایک مضمون میں تحریر کرتے ہیں۔

"خواجہ صاحب ہندوؤں کے تمام مشہور مندروں اور بتخانوں میں جاکر اپنے مریدوں کو عبرت دلاتے تھے کہ تم دیکھتے ہو ہندو نقرا بتوں کے سامنے سمادھی لگائے ہوئے اس قدر بے خود ہوتے ہیں کہ ان کو اگر کسی آنے جانے والے کا گھٹنا لگ جائے تو بیٹھے ہوئے گر تو جاتے ہیں لیکن اپنے مراقبہ اور سمادھی کو نہیں توڑتے۔ یہ کمال استغراق ہے۔ ادھر مسلمانوں

کا یہ حال ہے کہ اسلام کی حقیقی تعلیم فاعبد ربک و کانک تراہ و
ان لم تکن تراہ فانہ یراک کو بالکل بھلائے ہوئے ہیں۔ مسلمان
اپنی نمازوں میں اصول مراقبہ کو بھول جاتے ہیں۔ بلکہ آشنا بھی نہیں ہیں"
خواجہ صاحب جہاں اپنے مریدوں کو نماز روزے کی تاکید کرتے اور
درود وظائف بتایا کرتے تھے وہاں یہ بھی واضح کر دیا کرتے تھے کہ نماز
رسم نہیں ہے کہ اس کو رسم کے طور پر ادا کیا جائے بلکہ نماز کا ہر رکن خدائے
تعالیٰ کے ساتھ الگ معاملے کی صورت رکھتا ہے۔
تزکیہ نفس۔ معرفتِ حق اور اقامت دین خواجہ صاحب کی تعلیم کے
خاص اجزا تھے جن کا انہوں نے خود کو ایک نمونہ بنا کر اپنے مریدوں کو ان
کی اہمیت و افادیت سے آگاہ کیا

خواجہ صاحب کا مسلک

خواجہ غلام فریدؒ سلسلۂ چشتیہ سے
وابستہ تھے۔ لیکن اپنی وسیع المشربی
کی وجہ سے وہ کسی دوسرے سلسلے کو برا نہیں کہتے تھے۔ انہیں
سلسلۂ چشتیہ کے علاوہ قادریہ۔ سہروردیہ اور نقشبندیہ سلسلوں میں
بھی مرید کرنے کی اجازت تھی۔ جو شخص جس سلسلہ میں ان سے بیعت
کی خواہش کرتا وہ اسی سلسلے کے مخصوص طریقہ کے مطابق اس سے
بیعت لے لیتے تھے۔ مولانا غلام احمد اخترؔ لکھتے ہیں کہ

"آخر عمر میں سلسلۂ قادریہ کے اذکار اور شاغل آپ پر غالب ہو گئے
تھے اور ان میں آپ کے اوقات بسر ہوتے تھے اور فرماتے تھے کہ

سلسلۂ قادریہ آخر کار سب سلسلوں پر غالب آجاتا ہے۔

خواجہ صاحب کے دل میں علمائے دین کی بڑی عزت تھی۔ وہ بلالحاظ عقیدہ ہر عالم کو قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ مولانا عبدالرشید نسیمؒ اپنے ایک مضمون میں لکھتے ہیں۔

"موجودہ نواب کے دادا نے جب احمد پور کے پاس ڈیرہ نواب میں رہائش اختیار کی تو احمد پور شرقیہ میں ایک غیر مقلد مولوی احمد بخش بھی رہتے تھے۔ نواب کے خدام نے شکایت کی کہ مولوی احمد بخش وہابی اور اولیائے کرام کا منکر ہے اور ریاست میں اس کا رہنا خطرے سے خالی نہیں۔ اس کے یہاں رہنے سے وہابیت پھیلے گی۔ نواب نے بے سوچے سمجھے ان کے ریاست بدر کرنے کے احکام جاری کر دیئے مولوی احمد بخش کو جب معلوم ہوا تو وہ سیدھے حضرت خواجہ غلام فریدؒ صاحب کی خدمت میں حاضر ہوئے اور سارا ماجرا عرض کر دیا۔ آپ نے فرمایا مولوی صاحب آپ یہیں رہیں۔ عنقریب نواب صاحب آنیوالے ہیں۔ اللہ تعالیٰ فضل فرمائیگا۔ اور کچھ نہ کچھ تدارک ہو جائے گا۔ جب نواب صاحب آپ کی زیارت کے لئے آئے تو اس حکیم الامت نے براہ راست نواب صاحب سے اس معاملے میں کوئی بات نہ کی بلکہ جس وقت نماز کے لئے تشریف لے گئے تو آپ نے مولوی احمد بخش صاحب کو اشارہ فرمایا کہ وہ امامت کریں۔ چنانچہ خواجہ صاحب، نواب صاحب اور مولوی احمد بخش کی شکایت کرنے والے

سب لوگوں نے مولوی صاحب کی اقتدا میں نماز ادا کی۔ نواب صاحب فرطِ ادب سے دم بخود تھے اور یہ دیکھ کر حیران کہ خواجہ صاحب نے اس وہابی کے پیچھے نماز کیسے پڑھ لی۔ نماز کے بعد خواجہ صاحب نے عام لوگوں سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا۔ آج کل لوگ خدا بننے کی کوشش کر رہے ہیں۔ کوئی اپنے آپ کو مالک خیال کرتا ہے اور کوئی رازق۔ اللہ تعالیٰ کی خدائی میں تو کافروں کے لئے بھی جگہ ہے اور مشرکوں کے لئے بھی۔ کیونکہ

برِیں خوانِ یغما چہ دشمن چہ دوست

نواب صاحب پہلے ہی دل میں شرمندہ ہو رہے تھے۔ یہ بات سن کر دو زانو ہو گئے اور ہاتھ جوڑ کر عرض کی۔ قبلہ! مجھ سے غلطی ہو گئی میں اپنے احکام واپس لیتا ہوں۔ اور نہایت عاجزی سے مولانا کی خدمت میں عرض کرتا ہوں کہ وہ احمد پور شرقیہ واپس تشریف لے چلیں۔ خواجہ صاحب نے فرمایا کیوں نواب صاحب! کافروں کے لئے تو آپ کی ریاست میں جگہ عام ہے مگر موحدوں کے لئے آپ کے ہاں کوئی جگہ نہیں۔ یہ لوگ بہر حال توحید و رسالت کو تو مانتے ہیں۔ نواب صاحب نے سر جھکا کر نہایت لجاجت سے عرض کی کہ قبلہ زیادہ شرمندہ نہ فرمائیں میں مولانا کو واپسی پر اپنے ساتھ لے جاؤں گا اور انشاءاللہ آئندہ ایسی غلطی نہیں ہو گی"

اس واقعہ سے جہاں خواجہ صاحب کی وسیع المشربی اور اخلاقی عظمت کا اندازہ ہوتا ہے وہاں یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ وہ اظہارِ حقیقت میں کسی دنیاوی طاقت سے مرعوب نہیں ہوتے تھے۔

خواجہ صاحب کے دور میں صوفیائے کرام کے مابین وحدت وجود اور وحدت شہود کے بارے میں مباحث کا بازار گرم تھا۔ ایک مکتبِ فکر کے صوفی دوسرے مکتبِ فکر کے صوفیوں کی تردید میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے تھے۔ ایک دفعہ یہ مسئلہ ان کے سامنے بھی لایا گیا۔ لیکن انہوں نے بقول مولانا غلام احمد اختر مولینا جامی کی نفحات الانس۔ شیخ کمال الدین عبدالرزاق کاشانی اور شیخ رکن الدین۔ علاءالدولہ کے خطوط جو ایک دوسرے کی تردید میں تھے تمام و کمال پڑھ کر یہ فیصلہ صادر کیا کہ دونوں فرقوں میں نزاعِ لفظی سے زیادہ کوئی خاص اختلاف نہیں۔ بالفاظ دیگر وہ مسئلہ کی روح کو سمجھتے تھے اور ان فروعی باتوں کو قابلِ اعتنا نہیں گردانتے تھے۔ جو بلاوجہ باہمی نزاع کا باعث بنالی جاتی ہیں۔

خواجہ صاحب شریعتِ حقہ پر بڑی سختی سے کاربند تھے۔ انہیں ہندوانہ رسوم اور غیر مشروع اعمال سے بے حد نفرت تھی۔ عورتوں کی بے حجابی اور مردوں سے ان کا بے باکانہ اختلاط بھی سخت ناپسند تھا۔ ذیل کا اقتباس اسی حقیقت کا آئینہ دار ہے۔

"مثلاً لباسِ زنان بلاد ما کہ آستین پیراہن تا بیازد میدارند و باقی ہر دو دست برہنہ بیگذارند و کم کسے پردہ بر رخ و بدن مے نمائد واکثر

زنان معجریا بر سر دل کردہ روئے و جوانب سر دبازد و سینہ
بے کینہ خالی ساختہ مے نشینند و بے باکانہ و بے حجابانہ در بازار و
رسواق مے گردند و در بعض احیان با وجود احضار مردان غیر محرماں
معجریا بر کتف انداختہ جلوہ گرمے شوند و افتخار مے نمایند و در کتخدائی
نیز رسوم مذموم و ناشائستہ بسیار صدر یافتہ است چنانچہ مرداں و
نسواں باہم حلقہ بستہ رقص و پاکوبی مے سازند و دست بر دست
مے زند۔ درمیان حلقہ نقارہ مے نوازند وغیرہ ذالک من المنہیات و
المہلکات و ایں تمامی تنگونہا و رسمہا از مراسم ہندو کارہائے کفار
ناہنجار اند کہ در مسلماناں ہم متخل اند و محبوب و مرغوب مید انند و
اگر اوشاں را منع کردہ اید در جواب میگویند حسنا ما وجدنا علیہ
آباءنا"

ظاہر بینوں اور بر خود غلط لوگوں کے متعلق یہ رائے بھی قابل ملاحظہ ہے
"بعد ازاں فرمودند کہ بسا کار شیطانی اند کہ در نظر نیک و زیبا مے نمایند
و فی الحقیقت زشت و ابترے باشند کہ آدمی بکردن آں از تابعان
شیطان مے شود و خود عادت آں بے سعادت و لعین ازلی و شقی
ابدیست کہ فتنہائے اعجوب پیش جہلا ظاہر مے سازد و در گمراہی و
تباہی مے اندازد۔"

سابق ریاست بہاول پور کی حدود میں بھنگ کا بڑا رواج رہا ہے۔ ادنیٰ
تو ادنیٰ خاصے اچھے بھلے گھرانوں میں بھی لوگ اسے بطور نشہ نہیں بلکہ "ٹھنڈائی"

کے نام سے استعمال کرنے میں کوئی عیب تصور نہیں کرتے تھے۔ خواجہ صاحب ایسے لوگوں کے سخت مخالف تھے۔ چنانچہ ایک روایت کے مطابق جب انہیں یہ معلوم ہوا کہ شہر کے فلاں فلاں قوال اور گویئے بھنگ پیتے ہیں تو انہوں نے منظم طور پر ان کا سوشل بائیکاٹ کیا اور اپنے تمام معتقدین و متعلقین کو ہدایت کی کہ وہ ان لوگوں کو شادی بیاہ وغیرہ کی تقریبوں پر بلانا ترک کر دیں۔

خواجہ صاحب طریقت و شریعت کو لازم و ملزوم قرار دیتے تھے ان کے نزدیک اہل طریقت پر شریعت کی پابندی ان لوگوں سے زیادہ عائد ہوتی ہے جو "اہل ظاہر" کہلاتے ہیں۔ چنانچہ فوائد فریدیہ میں لکھا ہے

"بدانکہ اہل ظواہر کہ فقہا و محدث اند رضی اللہ تعالیٰ عنہا میگویند کہ ہر کس اوامر حق جل شانہ او خواہد کرد وازنواہی محترز خواہد بود و احتیاط مے نماید و تیج وقت نماز بطوریکہ در کتب فقہ مسطور است کہ وقت تکبیر اولیٰ رجوع کامل باشد پس از و باشد یا نباشد و صیام ماہ رمضان و زکواۃ مال از بیجاہ قدر ہیچ یا و حج یک بار اگر توفیق راہ است عمل نماید و نوافل را چنانچہ صیام دہر و قیام لیل و وظائف و ترک گناہ مناہی چنانچہ زنا و شراب الخمر و غیبت وغیرہا نہ نماید از اہل غفران خواہد شد و لائق بہشت مے شود و از خاص بندگان حضرت مولا جل شانہ و مجیب الدعوات گردد۔ بدانکہ اہل باطن کہ حضرات صوفیا اند قدس اسرارہم مے فرمانید کہ آنچہ اہل

ظواہر بگویند آں اولیٰ احتیاط است بلکہ احتیاط نیست پس شاید کہ اول بہ جادۂ شریعت موجب فرمودۂ اہل ظواہر ثبت قدم کردہ شود و پس ترقی نمودہ آید یانکہ نماز آں باید خواند کہ در تمام صلوٰۃ رجوع باشد والا جائز نیست کما قال علیہ الصلوٰۃ والسلام لا یجوز الصلوٰۃ الا بحضور القلب و صیام آنکہ از ہمہ ہوس انقطاع کند و از خوش خوردن و خوش خفتن وغیرہ لذات تائب گردد و اگرچہ در شریعت جائز باشد و زکوٰۃ آنکہ در خانۂ خود ہیچ ندارد و ہر چہ آید بدہد و قدر قوت یک وقت خود برگیرد و حج آنکہ رجوع بباطن خود کند چنانچہ ظاہر کعبہ را بیت اللہ خوانند قلب نیز بطریق اولیٰ بیت اللہ است قال اللہ تعالیٰ (حدیث قدسی) لا یسعنی ارضی ولا سمائی ولکن یسعنی قلب العبد المومن و چناں مستغرق تذکرہ و تفکر بودہ شود کہ ہمہ آن بجز اللہ بر زبان و بجز تفکر صفاتہ جل شانہ در دل نباشد و ہمہ کارہائے عالم جزو او در داشتہ شوند و نفع و ضرر کہ از خلق رسد و دانستہ شود نہ از خلق۔ النفع من اللہ واللہ یرضی۔"

جب یہ عقیدہ ہو کہ نفع و ضرر منجانب اللہ ہیں تو انہیں کون گزند پہنچا سکتا تھا۔ وہ غم زیاں اور فکر منفعت دونوں سے آزاد یاد الٰہی میں مصروف رہتے تھے۔ کہتے ہیں جب نواب بہاول پور کے محل میں ان کا قیام ہوتا تھا تو وہاں بھی ان کی فقیری کی شان علیحدہ نظر آتی تھی۔

دیوبندی اور بریلوی تضیہ بڑا پرانا ہے۔ ہر دو گروہ ایک

دوسرے پر لعن طعن میں کسر اٹھا نہیں رکھتے۔ خواجہ صاحب کے دور میں بھی یہ صف آرائی کافی زوروں پر تھی۔ لیکن خواجہ صاحب اس باب میں بھی بے لوث نظر آتے ہیں اور جہاں کہیں ان بزرگوں کا ذکر کرتے ہیں تو ان کا نام عزت و احترام کے ساتھ لیتے ہیں۔ ایک بار یہ مسئلہ درپیش تھا کہ صوفیائے کرام انبیاء و اولیاء سے استمداد و استعانت کرتے ہیں جو شرک ہے۔ توقع یہ تھی کہ خواجہ صاحب صوفی مشرب ہونے کی وجہ سے اس اعتراض کو رد کریں گے لیکن چونکہ وہ حقیقت پسند تھے اس لئے انہوں نے اپنے ہم مشربوں کو خوش کرنے کے بجائے یہ رائے دی

"کہ وہابیان گونہ مزاحمے دارند بصوفیہ کرام درامر توحید زیرا کہ وہابیان بگویند کہ استمداد و استعانت از انبیاء و اولیاء شرک است۔ بعد ازاں فرمودند کہ بے شک استمداد و استعانت از غیر خدا تعالیٰ شرک است توحید آنست کہ خاص از حق سبحانہٗ استعانت کند چنانچہ ایاک نعبد و ایاک نستعین ہم بریں معنی ناطق است"

فی الحقیقت خواجہ صاحب ایک ایسے سچے مسلمان تھے جس کے دل میں خدا کا خوف، نبی کی محبت اور خلق خدا کا درد ہو۔ ریا کاری اور کرامات سے ان کا دامن ہمیشہ بے داغ رہا۔

عادات و خصائل

خواجہ صاحب طبعاً خلوت پسند، کم گو اور کم خور واقع ہوئے تھے۔ انہیں عام ملاقاتیوں سے ملنا بڑا دوبھر معلوم ہوتا تھا۔ رات دن خلوت میں رہتے

اور جب کوئی بہت ہی ضرورت لاحق ہوتی یا کسی ملاقاتی کا اصرار ہوتا تو اپنے خلوت خانہ سے باہر آتے بات چیت میں ان کا انداز یہ تھا کہ وہ خاموشی سے گھنٹوں لوگوں کی گفتگو سنا کرتے اور خود کچھ نہ بولتے البتہ اگر اس تمام عرصہ میں کہیں بہت ہی زیادہ ضرورت محسوس ہوتی تو کسی حدیث نبوی یا کسی بزرگ کا قول بیان کر دیتے اور بس! کم خوری کا یہ عالم تھا کہ رمضان کے دنوں میں سحری کے وقت صرف دو آموں پر اکتفا کرتے اور افطار کے بعد معمولی کھانے کے چند لقموں سے زیادہ نہ کھاتے۔ شب بیداری بھی خواجہ صاحب کی خصوصیات میں سے تھی۔ ان کا رات کا اکثر حصہ جاگنے میں گذرتا تھا اور اس دوران وہ مختلف اشغال و اذکار کیا کرتے تھے۔ نماز روزہ کے بڑے پابند تھے۔ اکثر نماز با جماعت ادا کرتے۔ صفائی ستھرائی کا بہت خیال رہتا تھا گو ہر شب چراغ میں ارشاداتِ فریدی کے حوالے سے لکھا ہے کہ

"وضو کے وقت چھینٹوں سے بچنے کے لئے آپ چارپائی پر ہو بیٹھتے تھے۔ اگر زمین سخت ہوتی تو نیچے گھاس بچھوا دیتے تھے اور وضو کے لئے ایک وقت میں بارہ سیر پانی صرف ہوتا تھا"

خواجہ صاحب کو سیر و سیاحت کا بڑا شوق تھا۔ اسی شوق کے تحت انہوں نے ہندوستان کے اکناف و اطراف کا بارہا دورہ کیا اور

وہاں کے مشہور تاریخی مقامات بالخصوص بزرگانِ کرام کے مزارات پر گئے۔ کہتے ہیں کہ انہیں دنوں کے نحس یا مبارک ہونے کا بڑا خیال رہتا تھا۔ اشاراتِ فریدی میں لکھا ہے کہ،

"سفر کے متعلق آپ بہت محتاط تھے۔ چنانچہ چہار شنبہ کے دن باہر تشریف نہ لے جاتے۔ اگر بہرکیف جانا بھی پڑتا تو دفعیہ نحوست کے لئے پیتانہ نکلوا لیا کرتے تھے۔ یعنی روانہ ہونے سے ایک دن پہلے گذرگاہ میں شہر سے باہر لوگوں کی نظروں سے پوشیدہ غروب آفتاب سے پہلے تانبے کا پیسہ اور کچھ نمک کپڑے میں باندھ کر دفن کر دیا جاتا تھا اور پھر چلتے وقت نکال کر پیسہ کسی فقیر کو دیدیا جاتا تھا اور نمک خود خواجہ صاحب کے اپنے استعمال کے لئے رکھ لیا جاتا تھا۔"

خواجہ صاحب کی طبیعت میں جہاں صفائی حد درجہ تھی وہاں سادگی بھی بے انتہا تھی۔ اشاراتِ فریدی میں درج ہے۔

"عام طور پر خواجہ صاحب نہایت ہی سادہ لباس میں رہتے تھے جو عموماً ٹوپی، کرتہ اور تہمد تک ہی محدود تھا مشہور ہے کہ عرصہ تک ایک ہی پوشاک زیبِ تن رہتی تھی۔ جب آپ غسل فرماتے۔ تو نئے پارچات سِل کر آتے اور پرانے تبرکاً خدام میں تقسیم ہو جاتے۔"

اسی سلسلہ میں مزید تفصیل ملاحظہ ہو۔

"خاص مواقع مثلاً عیدین پر نمایاں فرق یہ ہوتا کہ ٹوپی سبز کمخواب

کی پہنتے تھے۔ اس پر زرد رنگ کی خط دار سالاری باندھتے تھے جو آپ کو تبرکاً اپنے پیرو مرشد جناب فخرالدین علیہ الرحمۃ سے ورثہ میں ملی تھی۔ اور جسے آپ بھی عیدوں پر ہی پہنا کرتے تھے۔ کندھوں پہ سُرخ رنگ کی زرکنار طلائی تارکش لنگی رکھتے تھے۔ بدن پر سفید ململ کا کرتہ ہوتا تھا۔ نیچے سفید خاصہ کا تہمد۔ پاپوش کامدار اور مطلا ہوتی تھی"

خواجہ صاحب کی طبیعت میں جود وسخا کا مادہ بھی کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا مناقب فریدی کا مصنف لکھتا ہے کہ آپ پیٹ ہی میں تھے کہ ماں کا کھانا چھوٹ گیا اگر کچھ کھاتیں تو قے ہو جاتی۔ اس بات کا انہوں نے اپنے خاوند سے ذکر کیا تو انہوں نے فرمایا کہ یہ فعل اس کا ہے جو تمہارے شکم میں ہے۔ وہ سخی مرد ہے۔ دوسروں کو نفع پہنچانا چاہتا ہے۔ چنانچہ اس روز سے ان کی والدہ نے مسکینوں اور محتاجوں میں کھانا تقسیم کرنا شروع کیا نتیجہ یہ ہوا کہ بیماری جاتی رہی۔

اس روایت کے مطابق سخاوت کا جذبہ خواجہ صاحب ماں کے پیٹ سے لے کر آئے تھے جو زندگی بھر ان میں موجزن رہا۔ وہ لوگوں کی بلا چون وچرا حاجت روائی کرتے اور سائلوں کو توقع سے زیادہ دیتے۔ ان کا لنگر بڑا وسیع تھا جس میں سے فقراء علماء اور غرباء کو دونوں وقت کھانا ملتا تھا۔ حاجتمند ہر وقت ان کے اردگرد رہتے تھے۔ کبھی ایسا نہیں ہوتا تھا کہ کوئی ان سے سوال کرے اور وہ اسے رد کر دیں۔ نفقر فرید میں

لکھا ہے کہ

"ایک دفعہ ایک صاحب نے آکر اپنی ضرورت پیش کی۔ اتفاق کی بات اس وقت حضرت کے پاس کچھ نہ تھا۔ شب بھر کے لیے مہلت چاہی تو وہ صاحب غرض بگڑ بیٹھے۔ حتیٰ کہ دشنام طرازی تک بھی معاملہ بڑھا دیا۔ مگر تھے وہ نسب کے سیّد، حضرت خواجہ علیہ الرحمتہ نے نہ صرف ضبط سے کام لیا بلکہ فرمایا کہ آپ نے مجھے میری حقیقت سے آشنا کیا۔ اللہ تعالیٰ آپ کو جزائے خیر دے پھر سائل کو اس کی ضرورت سے بھی زیادہ دے کر تکریم کے ساتھ روانہ فرمایا اور کہا میں تو سگِ آستانِ سادات ہوں۔"

اس واقعہ سے جہاں خواجہ صاحب کی کریم النفسی اور بخشش و عطا کا حال معلوم ہوتا ہے۔ وہاں یہ بھی اندازہ ہوتا ہے کہ خواجہ صاحب کو سادات سے کس درجہ عقیدت و محبت تھی۔ اسی سلسلہ میں ایک اور واقعہ ملاحظہ فرمایئے۔

"ایک دفعہ سید مہر شاہ صاحب نے آپ کے یہاں حاضر ہو کر عرض کیا کہ حضرت مجھ پر دو سو روپیہ سرکاری واجب الادا ہے۔ ادائیگی کی توفیق نہیں۔ کاردار صاحب خانپور میری گرفتاری کے درپے ہے عزت نفس کے علاوہ قومی تذلیل کا اندیشہ لاحق ہے۔ حضور نے شاہ صاحب کی یہ درد بھری کہانی سنتے ہی اسی وقت یک صد روپیہ شاہ صاحب کے حوالہ کیا اور ساتھ ہی ایک مکتوب گرامی کاردار صاحب کے نام لکھ کر بقیہ رقم کی ادائیگی اپنے ذمہ لے لی۔"

نفرِ فرید میں مذکورہ بالا مکتوب کا اصل مضمون بھی درج ہے جو خالی از
دلچسپی نہ ہوگا۔

"کاروار صاحب خانپور سلمہ اللہ تعالیٰ

از فقیر غلام فرید بعد سلام آنکہ تحق سید مہر شاہ صاحب احتیاج
چنداں سفارش نیست کہ پیش بندگان اسلام سیادت ذریعہ اوشاں
کافی است مبلغ یکصد روپیہ ارسال و دیگر یکصد را فقیر ذمہ دار است
شاہ صاحب را چگونہ تکلیف نہ دہند والسلام۔"

کہتے ہیں کہ نواب صادق محمد خان رابع جو خواجہ صاحب کے مرید تھے جب
چاچڑاں تشریف لے جاتے تو آٹھ ہزار روپیہ خواجہ صاحب کی خدمت میں پیش
کرتے اور جب وہاں سے رخصت ہونے لگتے تو دوبارہ آٹھ ہزار روپے
نذر کرتے۔ اس کے علاوہ نواب صاحب وقتاً فوقتاً خواجہ صاحب کو نقد
روپیہ بھیجتے رہتے تھے۔ لیکن یہ روپیہ آنے کی دیر ہوتی تھی کہ انہیں اس کے
ختم کرنے کی فکر لاحق ہو جاتی تھی۔ ادھر روپیہ آیا اور اُدھر انہوں نے اپنے
مختار کار کو بلا کر ہدایت کی کہ اس قدر روپیہ مودی خانے کے قرضے میں
مودی کو اور اس قدر تنخواہ داروں کو۔ اس قدر معمول داروں کو اور
جو باقی رہا اسے سائلین جو بطور مہمان موجود ہیں ان میں سے فلاں شخص
کو اس قدر اور فلاں کو اس قدر دیدیا جائے۔

مولانا غلام احمد اختر لکھتے ہیں کہ

"ایک دفعہ میری موجودگی میں خرچ کی تمام تفاصیل بتلا کر فرمایا کہ اور

کوئی تو میرے خیال میں رہا نہیں۔ رقومات کے میزان سے معلوم ہوا

کہ سات سو روپیہ بچتا ہے۔ یہ سن کر فرمایا کہ اس سات سو روپے کو

ان اشخاص پر بموجب رقومات حصہ رسدی کے طور پر تقسیم کر کے خرچ

کو آمدنی کے برابر کر دو۔ پھر فرمایا کہ نماز ظہر کا وقت آگیا ہو تو پہلے نماز

سے فارغ ہولیں"

مولانا غلام احمد عزیز لکھتے ہیں کہ

"ان سب لوگوں کو جو روپیہ ملاتے تھے خواجہ صاحب کی طرف سے

یہ تاکید ہوتی تھی کہ روپیہ ایسے وقت لایا کریں کہ کسی نماز کا وقت نہ ہو"

خواجہ صاحب کا یہ عمل اس بات کا آئینہ دار ہے کہ انہیں مال و دولت

سے قطعی محبت نہ تھی اس کے باوجود کہ ان کی پرورش نوابی محل میں ہوئی تھی اور

والیان ریاست ان کے حلقۂ ارادت میں شامل تھے جن کی طرف سے نذر

کی صورت میں ہزاروں روپیہ آتا رہتا تھا۔ خواجہ صاحب کا دل روپیہ پیسہ

کی طرف کبھی مائل نہ ہوا۔ وہ مال و دولت کو خللِ ایمان سے تعبیر کرتے

تھے اور ان کی یہ کوشش ہوتی تھی کہ جتنی جلدی ممکن ہو اس سے فراغت

حاصل کرلیں۔ وہ ضرورتمندوں کی بڑی سے بڑی خواہش پوری کرنے میں

بھی کبھی تامل نہیں کرتے تھے۔ کہتے ہیں کہ آخری عمر میں انہیں یہ افسوس

تھا کہ کسی نے ان سے ایک لاکھ روپے کی فرمائش نہیں کی۔

موسیقی کا شوق

خواجہ صاحب کو موسیقی سے خاص لگاؤ تھا

وہ سلسلہ چشتیہ کے دوسرے بزرگوں کی طرح

بڑے خشوع و خضوع کے ساتھ قوالی سنا کرتے تھے۔ برکت ان کا محبوب قوال تھا جو ہمیشہ ان کے ساتھ رہا کرتا تھا۔ خواجہ صاحب نے خود اس کی تربیت کی تھی اور اسے اپنی پسندیدہ طرز میں کافیاں یاد کرائی تھیں۔ مشہور ہے کہ وہ گھنٹوں اس سے قوالی سنا کرتے تھے۔ کبھی کبھی دریا کی سیر کو نکل جاتے اور کشتی میں بیٹھکر سطح آب پر راگ راگنی کا لطف اٹھاتے۔ قوالی کی محفلوں میں ان کی حالت خاص طور پر دیکھنے کے قابل ہوتی تھی۔ اشارات فریدی میں لکھا ہے

"خواجہ صاحب کا یہ حال تھا کہ دورانِ وجد سر مبارک کو دائیں بائیں جنبش دیتے تھے اور سخت گریہ فرماتے تھے۔ یہانتک کہ بعض اوقات آنسو پوچھتے پوچھتے رومال پر رومال بدلنے کی نوبت آجاتی تھی"

قوالی اور موسیقی سے خواجہ صاحب کا یہ ذوق کچھ تو سلسلۂ چشتیہ سے ان کی وابستگی کی وجہ سے تھا جس میں سماع کو بڑی اہمیت حاصل ہے اور کچھ ان کی افتاد طبع کے زیر اثر تھا جس کا دوسرا نمایاں نتیجہ ان کی شاعری کی صورت میں ظاہر ہوا۔ شاعری اور موسیقی کا ویسے بھی آپس میں گہرا تال میل ہے۔ چنانچہ ایک تحریک نے دوسری تحریک کو جلا دی اور اس طرح شاعری اور موسیقی کا ذوق منتہائے کمال کو پہنچ گیا

خواجہ صاحب ہندوستان کی کلاسیکی سنگیت سے بھی پوری طرح آگاہ تھے۔ اور مقامی گیتوں کی لے اور آہنگ پر بھی عبور رکھتے تھے ان کی اس موسیقی دانی کی شہادت ان کے کلام سے بھی ملتی ہے جن میں نغمگی کوٹ

کوٹ کر بھری ہوئی ہے۔ بعض کافیوں کی تانیں اور بحریں بھی مخصوص، راگنیوں کی طرز پر تجویز کی گئی ہیں خواجہ صاحب کے قوال برکت کا یہ کام ہوتا تھا کہ وہ کافی مکمل ہونے پر اسے مجوزہ راگنی کی طرز پر گا کر سناتا تھا۔ خواجہ صاحب حسب ضرورت اس میں ترمیم و اصلاح کرتے تھے اس تربیت کا یہ نتیجہ نکلا کہ وہ اس فن میں طاق ہو گیا اور خود نئی نئی راگنیاں، اختراع کرنے لگا۔ مقابیس المجالس میں اس کے متعلق خواجہ صاحب کی یہ رائے درج ہے۔

"بعد ازاں فرمودند کہ ایں برکت علی ہم در فن کمالے عظیم دارد چنانچہ او میگوید کہ بقدر چہار صد راگنی میدارم و اکنوں او را دریں فن راگ ملکہ حاصل شدہ است و دریں باب ولے عالم و فاضل است تالیف و اختراع ہر راگنی کہ مے خواہدے تواند کرد"

موسیقی سے خواجہ صاحب کی اس غیر معمولی رغبت کا حال پڑھ کر ممکن ہے کسی کے دل میں یہ خیال پیدا ہو کہ خواجہ صاحب عالم دین ہونے کے باوجود اس غیر شرعی فعل کو کیوں گوارا کرتے تھے لہذا اس سے پہلے کہ اس بقرضے پر بحث کی جائے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ یہاں خواجہ صاحب کے ملفوظات میں سے کچھ اقوال درج کر دیئے جائیں۔ فوائد فریدیہ میں لکھا ہے۔

"بدانکہ ہر اقسام سرود چنانچہ دف و جلاجل و طبل و شاہین و غیرہم جائز اند سوائے مزامیر و اوتار و طبلک"

مزید ارشاد ہوتا ہے

"دنیست جائز شنودن آواز امرداں و نساء غیر مملوکہ شرعیہ"

یعنی نہ صرف مزامیر کا استعمال ناجائز ہے بلکہ نابالغ لڑکوں اور غیر عورتوں سے گانا سننا بھی ممنوع ہے اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جب مسئلہ کی شرعی حیثیت بھی خواجہ صاحب پر پوری طرح واضح تھی تو انہوں نے اس غیر شرعی فعل سے اجتناب کیوں نہ کیا اور بالالتزام سماع کی محفلیں کیوں منعقد کرتے رہے۔ اس کا جواب خود خواجہ صاحب کی زبان سے سنیئے۔

"اگر از شنیدن سماع نفس مردہ شود و دل زندہ و عشق جل جلالہٗ یا دوستان او تیز اید گیر و حلال است بہر طوریکہ باشد والا حرام است بالاتفاق عند الفقہا والصوفیہ۔"

مطلب یہ ہے کہ اگر سماع خدا سے لو لگانے کا باعث بنے تو جائز اور اگر اس سے کوئی دوسرا جذبہ پیدا ہو تو وہ ناجائز ہے۔

خواجہ صاحب کا یہ قول محض قول کی ہی حد تک نہ تھا بلکہ اس پر ان کا عمل بھی تھا۔ وہ صوفیائے کرام کے مقررہ آداب سماع کا پورا خیال رکھتے تھے اور کسی کو مجلس سماع میں ناشائستہ و بیہودہ حرکت کرنے کی اجازت نہ دیتے تھے۔ یوں بھی ان کی محافل سماع میں وہی لوگ موجود ہوتے تھے جو سماع کی مجوزہ قیود پر کاربند رہنے کی صلاحیت رکھتے تھے جہاں تک خشوع و خضوع کا تعلق ہے یہ پہلے بیان ہو چکا ہے کہ ان پر اس قدر رقت طاری ہوتی تھی کہ آنسو پونچھتے پونچھتے رومال پر رومال بدلنے کی نوبت آجاتی تھی۔ ظاہر ہے وجد و حال کی یہ کیفیت نفسانی خواہشات کا نتیجہ نہیں ہو سکتی۔

خواجہ صاحب کا رومان

خواجہ صاحب جیسے صاحب دل انسان کے بارے میں یہ خیال غلط معلوم نہیں ہوتا کہ وہ عشق حقیقی کے علاوہ عشقِ مجازی سے بھی دو چار ہوئے ہوں گے۔ روہی سے ان کی غیر معمولی دلچسپی اور وہاں مدت الایام رہائش پذیری سے یہ قیاس حقیقت کے بہت قریب معلوم ہوتا ہے کہ خواجہ صاحب کسی گوشت پوست والے مجسمۂ حسن پر ضرور فریفتہ ہوئے ہوں گے اور ان کا وہ مطلوب کسی شہر کا رہنے والا نہیں بلکہ روہی نژاد ہوگا۔ خواجہ صاحب کی شاعری کا بیشتر حصہ اس رومان کی نشان دہی کرتا ہے۔ اس خیال کی تائید "گوہرِ شب چراغ" کی اس روایت سے بھی ہوتی ہے۔

"جس نگاہِ لیلیٰ وش نے آپ پر بجلیاں گرائیں وہ ہوت نام ایک عورت کی چشمِ کافر کی افسوں طرازی تھی۔ جس کی شکل و شباہت پر قلم اٹھانا خارج از بحث معلوم ہوتا ہے۔ کیونکہ عشق چیز دلوں کو دو نیم کرنے میں بخیہ گر کی سوئی اور جلاد کی تلوار دونوں برابر ہیں۔"

ہوت نامی عورت جس کا ذکر اس روایت میں کیا گیا ہے روہی (چولستان) کے علاقہ کی رہنے والی تھی۔ روہیلے اب بھی روہی والی مائی کے نام سے اسے یاد کرتے ہیں۔ "گوہرِ شب چراغ" میں جو خواجہ صاحب کے انتقال کے تھوڑے ہی عرصہ بعد طبع ہوئی تھی اور جسے اس موضوع پر اردو میں اولین کتاب ہونے کا بھی فخر حاصل ہے خواجہ صاحب کے رومان یا عشقِ مجازی کے حق میں تائیدی دلائل بھی پیش کئے گئے ہیں۔ لکھا ہے۔

"جس بے حس کو کسی پیکرِ حسن کی صدائے شیریں نے مبہوت اور لایعقل نہ کر دیا ہو۔ اس کو سازِ ازلی کی نغمہ سرائی پر کیونکر وجد آئے۔ جس بدنصیب کو کسی مستِ حسن کی نگاہِ بے محابا بیخود نہ کر سکے اِسے جلوۂ طور پر کیوں غش آنے لگا۔ قاعدہ ہے کہ جو فتیلہ پہلے جل چکا ہو وہ فوراً آگ پکڑ لیتا ہے۔ لیکن نئے فتیلے کو بہت دیر تک آگ دکھانی پڑتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ سودا زدگانِ حقیقت جو شاہدِ ازلی کے جاں دادہ ہیں انہیں بھی عشق مجازی کے کوچے میں در و دیوار سے سر ٹکراتے دیکھا گیا ہے۔ پس اگر ہمارے خواجہ بھی اس میدان میں گامزن ہوئے ہوں تو کوئی قابلِ اعتراض بات نہیں۔"

جو لوگ خواجہ صاحب کو منزہ من الخطا تصور کرتے ہیں اور عشق مجازی کو انسانی عظمت کے خلاف خیال کرتے ہیں وہ اس داستانِ عشق کو حقیقی عشق کا رنگ دے کر خواجہ صاحب کی زندگی کے اس اہم رُخ پر پردہ ڈال دیتے ہیں۔ چنانچہ مولانا عبدالرشید نسیمؔ جو خواجہ صاحب کے حالاتِ زندگی سے اچھے خاصے باخبر اور کلامِ فرید کے صحیح مفسر سمجھے جاتے ہیں جب خواجہ صاحب کی رومانوی زندگی پر قلم اٹھاتے ہیں تو حقیقت نگاری کے بجائے وہی عقیدت کیشی سامنے آجاتی ہے۔ وہ اپنے ایک مضمون میں لکھتے ہیں۔

"تذکروں میں اگرچہ اس کا ذکر نہیں مگر زبانی اور مقامی روایات میں فرید کے صرف ایک رومان کا پتہ چلتا ہے جس کا تعلق ملتان کے ایک ادنےٰ خانوادے سے تھا۔ مگر اس میں بھی خواجہ صاحب کا کردار

اس تدر بے لوث ہے کہ اسے مافوق البشر ہی کہا جا سکتا ہے۔ اور اس کا انجام بھی شرعی نکاح پر ہوا۔ مگر ان کے کلام میں اس رومان کی طرف ایک ادنیٰ اشارہ بھی موجود نہیں "

تعجب ہے مولانا نسیم خواجہ صاحب کے رومان کا پتہ بھی بتاتے ہیں لیکن ساتھ ہی اس کا ذکر اس انداز میں کرتے ہیں کہ کہیں کوئی خواجہ صاحب کو عام بازاری عاشق نہ سمجھ بیٹھے۔ یہاں یہ سوال درپیش نہیں کہ خواجہ صاحب کا عشق ارفع تھا یا ادنیٰ۔ عشق کی بلندی و پستی تو ظاہر ہے عاشق کے ذاتی کردار پر منحصر ہوتی ہے اور اس باب میں خواجہ صاحب جیسے رفیع المرتبت انسان کے متعلق شک و شبہ کی کسے جرأت ہو سکتی ہے۔ لیکن اصل بات تو وہ ہے جس کی تائید مولانا نسیم نے خود کی ہے۔ یعنی یہ کہ خواجہ صاحب نے کسی عورت سے عشق کیا جس کا تعلق ملتان کے ایک ادنیٰ خانوادے سے تھا۔ اور اس کا انجام شرعی نکاح پر ہوا۔

اول تو عشق زمان و مکان اور ذات پات سے وری الوری چیز ہے خواجہ صاحب کے متعلق یہ کہنا کہ وہ کسی ادنیٰ خانوادے کی عورت پر عاشق ہو گئے تھے اس سے خواجہ صاحب کی عظمت میں کمی واقع نہیں ہو سکتی اور نہ یہ کہہ کر عشق کی تہمت خواجہ صاحب کے دامن سے ہٹائی جا سکتی ہے کہ ان کے عشق کا انجام شرعی نکاح پر ہوا۔

گوہر شب چراغ کے مصنف محمد انور فیروز مرحوم اور مولانا عبدالرشید نسیم مرحوم کی مذکورہ بالا روایات میں ایک جزوی اختلاف بھی ملتا ہے۔ محمد انور فیروز خواجہ

صاحب کی معلوبہ کو روہی کی رہنے والی بتلاتے ہیں اور مولانا نسیم اسے ملتان کے کسی ادنیٰ خانوادے سے منعلق قرار دیتے ہیں۔ علاوہ ازیں مولانا نسیم یہ بھی لکھتے ہیں کہ خواجہ صاحب نے اپنے کلام میں اس رومان کی طرف ایک ادنیٰ اشارہ بھی نہیں کیا جب کہ محمد انور فیروز اس رومان کی مثالیں خواجہ صاحب کے کلام سے پیش کرتے ہیں چنانچہ یہ شعر بھی انہوں نے اپنے دعوے کے ثبوت میں نقل کیا ہے۔

گل زلف پنل دا پیچ پئیم
ہتھ ہوت دے دلڑی ویچ ڈتم

محمد انور فیروز کی یہ تحقیق اس لئے نسبتاً زیادہ وزندار ہے کہ ان کا دور خواجہ صاحب کے دور سے بہت متصل ہے۔ نیز ان تک صحیح روایات کا پہنچنا اس وجہ سے بھی درست معلوم ہوتا ہے کہ وہ خاص بہاول پور کے رہنے والے تھے جہاں خواجہ صاحب نے بچپن سے جوانی اور جوانی سے بڑھاپا تک گذارا تھا۔

اس کے برعکس مولانا نسیم ڈیرہ غازی خان کے رہنے والے ہیں اور ان کے اور خواجہ صاحب کے دور میں کافی بُعد ہے۔ مزید براں جیسا کہ مولانا نسیم نے خود اپنے مضمون میں لکھا ہے کہ ان کے والد اور خواجہ صاحب کے فرزند ہمدرس اور خواجہ صاحب کے شاگرد تھے ان تک کسی ایسے واقعہ کا پہنچنا جس سے سوء ظنی کا پہلو نکلتا ہو ممکن نظر نہیں آتا۔ جہاں تک مولانا نسیم کے اس ارشاد کا تعلق ہے کہ خواجہ صاحب نے اپنے کلام میں

ملتان والے رومان کی طرف ایک ادنیٰ اشارہ بھی نہیں کیا اس سے محمد انور فیروز کی صداقت بیان تو ظاہر ہوتی ہے لیکن ان کی اپنی تحقیق کا رتبہ بلند نہیں ہوتا۔ انہوں نے ملتان کے جس ادنیٰ خانوادے سے خواجہ صاحب کا رومان منسوب کیا ہے وہ یا تو سرے سے تھا ہی نہیں اور اگر ہوگا تو اتنا سرسری ہوگا کہ انہوں نے اسے اپنے کلام میں جگہ دینا مناسب نہ سمجھا۔ برخلاف اس کے جس رومان کا ذکر محمد انور فیروز نے اپنی کتاب میں کیا ہے اس کے اشارے بہت کثرت سے دیوان فرید میں ملتے ہیں۔

محمد انور فیروز خواجہ صاحب کے تنقیص نگاروں میں سے نہ تھے انہیں بھی خواجہ صاحب سے اتنی ہی عقیدت اور محبت تھی جتنی کسی اور کو ہو سکتی ہے لیکن فرق صرف نقد و نظر کے توازن کا ہے جسکا ہر نقاد کو پاس ہونا چاہیئے۔ مولانا نسیم جوشِ عقیدت میں خواجہ صاحب کے واردات قلب کو مافوق البشر فعل سے تعبیر کرتے ہیں اور محمد انور فیروز خواجہ صاحب کے عشق مجازی کو عشق حقیقی کو ذریعہ قرار دے کر ان کی منزلت میں اضافہ کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ چنانچہ لکھا ہے۔

"مشہور ہے کہ اٹھارہ سال تک ریگستان میں ڈیرے ڈال کر بیٹھے رہے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ مطلوب مجازی کے حصول میں تو بجا طور پر جو مسرت آپ کو ہوئی تھی ہوئی۔ لیکن اس سے زیادہ جاں بخش اور راحت افزا وہ کامیابی تھی جو حقیقی طور پر ان صعوبتوں کی برداشت

کا صلہ شمار ہونی چاہیئے یعنی یہ کہ دربار ایزدی میں رسائی حاصل ہوئی"
محمد انور فیروز کی تحقیق مقامی روایات سے بہت مطابقت رکھتی ہے۔
راقم الحروف کو چولستان اور بالخصوص اس علاقہ میں جانے کا متعدد بار اتفاق ہوا ہے جہاں خواجہ صاحب نے برس ہا برس قیام کیا تھا۔یہاں بعض ایسے لوگ بھی ملے جنہوں نے اپنی اوائل عمر میں خواجہ صاحب کو دیکھا تھا۔انہیں میں اس خاندان کے بعض افراد بھی تھے جس کی ایک دوشیزہ کو خواجہ صاحب کی محبوبہ ہونے کا فخر حاصل ہوا تھا۔ انہوں نے بتایا کہ خواجہ صاحب پہلے پہل اپنے مرید خاص نواب بہاولپور کے ہمراہ یہاں تشریف لائے تھے اور" ٹوبھہ تراوا" کے مقام پر ایک خیمہ میں قیام کیا تھا۔ ٹوبھہ تراوا چولستان کی مشہور زیارت گاہ چنن پیر سے تقریباً ۴ میل کے فاصلہ پر ہے چولستان میں خواجہ صاحب کا یہ ورود اس سرور و انبساط کے حصول کی غرض سے تھا جو ایک عاشق صادق کو بادیہ پیمائی اور صحرا نوردی میں حاصل ہوتا ہے۔ چنانچہ اسی ذوق کی تکمیل کے لیے انہوں نے چولستان کی راہ لی اور ٹوبھہ تراوا کے مقام پر خیمہ زن ہوئے۔یہاں آس پاس کے لوگ اپنی بھیڑ بکریوں کو پانی پلانے لاتے تھے۔ ایک دن خواجہ صاحب اپنے خیمہ کے باہر چہل قدمی کر رہے تھے کہ یکبارگی ان کی نظر ایک لڑکی پر پڑی جو بھیڑوں کے ریوڑ کو ہنکا رہی تھی۔ یہ لڑکی شکل و صورت میں کچھ زیادہ حسین نہ تھی لیکن اس کا الھڑپن اور سادگی خواجہ صاحب کو ایسی بھائی کہ وہ اس پر ہزار جان سے عاشق ہو گئے۔ وہ ہر روز

اپنی بھیڑوں کو پانی پلانے وہاں لاتی اور خواجہ صاحب پہلے ہی سے اس کے انتظار میں وہاں کھڑے ہو جاتے۔ جب تک وہ اپنی بھیڑوں کے ساتھ وہاں رہتی خواجہ صاحب ٹکٹکی باندھے اس کو دیکھتے رہتے

ایک دن انہوں نے دیکھا کہ بھیڑوں کے کچھ بچے ایک تپتے ہوئے ٹیلے پر چڑھ گئے ہیں جہاں ان کے پیر جل رہے ہیں اور وہ لڑکی انہیں بچانے کے لئے ٹیلے پر چڑھ رہی ہے اس منظر نے خواجہ صاحب کو بیقرار کر دیا اور وہ اضطراری کیفیت میں دوڑ کر لڑکی کے پاس جا پہنچے اور اس کے سر پر کپڑے کی چھتری کا سایہ کر دیا۔ اس لڑکی نے تو شاید خواجہ صاحب کے اس فعل کو محض ہمدردی سے ہی تعبیر کیا ہوگا۔ لیکن دوسرے دیکھنے والے بھانپ گئے کہ خواجہ صاحب اس پر عاشق ہوگئے ہیں۔ رفتہ رفتہ اس عشق کا حال لڑکی کے والدین اور دیگر کنبے والوں کو بھی ہو گیا وہ لوگ قبائلی رسوم و قیود کے مطابق اس بات کو سخت قابل اعتراض سمجھتے تھے کہ ایک غیر چولستانی ان کی لڑکی سے عشق کا دم بھرے۔ چنانچہ انہوں نے خواجہ صاحب کی مخالفت ہی نہ کی بلکہ انہیں طرح طرح کی اذیتیں بھی پہنچائیں۔ وہ ہر تکلیف کا مقابلہ کرتے ہوئے ثابت قدم رہے۔ اس سلسلہ میں ان سے کچھ کرامات بھی ظاہر ہوئیں جو مقامی روایات کی رو سے بعد میں ان کی کامیابی کا پیش خیمہ ثابت ہوئیں۔ کہتے ہیں ایک دفعہ خواجہ صاحب ایک ٹیلے پر سفید چادر تانے تن تنہا سو رہے تھے کہ ان کے مخالفوں میں سے کسی کی نظر ان پر پڑی

اُس نے جاکر اپنے دوسرے ساتھیوں سے یہ صلاح کی کہ اس وقت خواجہ صاحب کو چپکے سے قتل کر دیا جائے تو سارا فساد ختم ہو جائے گا۔ چنانچہ وہ لوگ کلہاڑیاں لے کر اس موقع پر پہنچ گئے اور غیظ و غضب میں وار پر وار کرتے گئے لیکن تھوڑی دیر کے بعد جب انہوں نے چادر اٹھا کر دیکھی تو وہاں کوئی موجود نہ تھا۔ چولستان کے باشندوں کا کہنا ہے کہ اس قسم کی کرامات سے خواجہ صاحب نے اپنے مخالفوں کو رام کر لیا اور وہ ان کے زبردست معتقد ہو گئے۔

کہتے ہیں کہ جب خواجہ صاحب کی اس دل گرفتگی کا حال نواب صاحب کو معلوم ہوا تو انہوں نے چاہا کہ حصول مطلب کے لئے وہ سعی کریں لیکن خواجہ صاحب نے اپنے جذبِ صادق پر بھروسہ کرتے ہوئے انہیں اس سلسلہ میں کسی قسم کی سعی و کوشش کی اجازت نہ دی۔ نواب صاحب اپنے مرشد کی پریشان خاطری سے بڑے آزردہ تھے انہوں نے اشارات و کنایات میں ایک دو بار یہ بھی کہا کہ اگر خواجہ صاحب چاہیں تو ریاست کی حسین سے حسین لڑکی ان کے عقد میں آسکتی ہے لیکن وہاں تو دل کا سودا پہلے ہی چکایا جا چکا تھا اب ان کی نظر کسی اور پر کیسے ٹھہرتی۔ چنانچہ انہوں نے ہر ابتلا اور آزمائش کو گوارا کیا لیکن ترکِ عشق پر آمادہ نہ ہوئے آخر جیت محبت کی ہوئی اور خواجہ صاحب کو وہ گوہر مقصود مل گیا جس کے لئے انہوں نے گھر بار چھوڑ کر چولستان کو بسایا تھا۔ مقامی لوگوں کا کہنا ہے کہ جب خواجہ صاحب اپنی محبوبہ کو حاصل کرنے میں کامیاب ہو گئے تو

انہوں نے اس سے باقاعدہ نکاح کیا اور نکاح کر کے اسے اپنے ساتھ چاچڑاں شریف لے گئے جہاں ان کی مستقل رہائش تھی

خواجہ صاحب کا یہ گوہرِ مقصود جسے خواجہ صاحب ہوت اور پنل کے نام سے یاد کرتے تھے توم لاڑ کی دوشیزہ تھی۔ اس کا اصل نام بھنو تھا لیکن لفظ ہوت اس قدر مشہور ہوا کہ وہ آخر دم تک اسی نام سے یاد کی جاتی رہی۔ خواجہ صاحب کی یہ محبوبہ کافی طویل عمر لے کر آئی تھی۔ چنانچہ خواجہ صاحب کے انتقال کے بعد تقریباً ساٹھ سال زندہ رہ کر ابھی دو تین سال قبل ہی وہ اللہ کو پیاری ہوئی ہے۔ سوءِ اتفاق سے اس کے بطن سے کوئی بچہ پیدا نہیں ہوا تھا۔ لہذا خواجہ صاحب کے اس عشق کی یادگار مجسم صورت میں کوئی موجود نہیں۔ البتہ ان کے اشعار جو معنوی اولاد کا درجہ رکھتے ہیں ان کے عشق کی بہترین یادگار ہیں۔

خواجہ صاحب کی عائلی زندگی

کسی شخص کو مافوق البشر قرار دینے سے اس کی انسانی عظمت میں اضافہ نہیں ہوتا

بعض لوگ جوشِ عقیدت میں خواجہ صاحب کو دنیاوی انسان کے بجائے عالم بالا کا فرد ثابت کرنے کی ناواجب کوشش کرتے ہیں۔ حالانکہ خواجہ صاحب عام انسانوں کی طرح تھے۔ انہوں نے دین کو دنیا سے علیحدہ کیا نہ دنیا کی خاطر دین پر حرف آنے دیا۔ وہ صوم و صلوٰۃ کے پابند۔ احکام شرع کے قائل اور دنیاوی اقدار پر پوری طرح عمل پیرا تھے۔ انہوں نے باقاعدہ شادی بھی کی جس سے ایک فرزند اور ایک دختر تولد ہوئے

خواجہ صاحب نے ایک نیک و بلند کردار خاوند کے علاوہ ایک مشفق باپ کے بھی فرائض ادا کئے۔ اولاد کی تعلیم و تربیت پر خصوصی توجہ صرف کی۔اور ان کی شادی بیاہ کی ذمہ داریوں سے احسن طریق پر عہدہ برآ ہوئے ان کے فرزند خواجہ محمد بخش نازک جو بعد میں خواجہ صاحب کے جانشین ہوئے انہی کے تربیت یافتہ تھے۔ انہوں نے اپنے بیٹے کو روحانی تعلیم ہی نہیں دینی و دنیاوی تعلیم بھی خود دی تھی۔

مجاہدۂ نفس

مجاہدۂ نفس تصوف کی شرط اوّل ہے۔ صوفیا اسی شرط کی تکمیل میں ترکِ علائق کر کے جنگلوں اور پہاڑوں کی راہ لیتے رہے ہیں۔ بعض تو اس معاملے میں اس درجہ آگے بڑھ گئے کہ انہوں نے ازدواج و تاہل سے بھی کنارہ کر لیا۔ لیکن خواجہ صاحب چونکہ مجرد رہبانیت کے قائل نہ تھے اس لئے انہوں نے تصوف کی شرط کو پورا کرتے ہوئے دشت و جبل کا رُخ تو کیا لیکن دنیا سے قطعی بیگانہ نہیں ہوئے۔ روایت ہے کہ انہوں نے اپنی زندگی کے اٹھارہ سال روہی میں گذارے اور وہاں خدا کی عبادت میں مصروف رہے۔ چنانچہ مناقب فریدی میں لکھا ہے۔

"طبع عالی کو دُنیا اور اہلِ دُنیا سے تنفر پیدا ہوا۔ آخر بمقام روہی علاقہ ریگستان میں تشریف لے جا کر وہاں ایک گپھا تیار کرا کے اٹھارہ سال کامل عبادت حق میں مصروف رہے۔ وہاں یہ وطیرہ تھا کہ جب بہت سے طالبِ خدا جمع ہوتے۔ تھوڑی دیر کے

واسطے باہر برآمد ہو کر ان کی حاجت روائی فرماتے۔ جو خدام کہ
ہمراہ تھے ان کو بھی آٹھ پہر میں بوقت افطاری روزہ باریابی
ہوتی تھی۔"

روہی میں خواجہ صاحب کا یہ طویل قیام ان کے مجاہدۂ نفس کا واضح
ثبوت ہے۔ یہ وہ علاقہ ہے جہاں ریت کے تودوں اور بے آب و گیاہ
چٹیل میدانوں کے علاوہ دور دور آبادی کا نشان نظر نہیں آتا۔ یہاں
خواجہ صاحب کو وہ خلوت بھی میسر تھی جسے وہ طبعاً پسند کرتے تھے اور
وہ یکسوئی بھی تھی جو سالک راہِ حق کے لیے ازبس ضروری ہوتی ہے انہوں
نے روہی کی وحشتناک تنہائیوں میں عبادت و ریاضت کی تمام منزلیں طے
کیں اور اپنا دل اس ویرانے سے ایسا لگایا کہ اس کے سامنے دُنیا
کی تمام رونق ان کی نظروں میں ہیچ ہو گئی۔

سفرِ حج

خواجہ صاحب نے ہندوستان کے تمام مشہور مقامات
کی سیر اور اولیاء اللہ کے مزارات کی زیارت کے
علاوہ حج کی سعادت بھی حاصل کی تھی۔ ان کا یہ سفرِ سعادت تاریخی
حیثیت کا تھا۔ کہتے ہیں جب وہ سفر پر روانہ ہوئے تو مریدین ومعتقدین
کی ایک بڑی جماعت ان کے ساتھ ہو گئی اور ان کے تمام اخراجات سفر
خواجہ صاحب نے برداشت کیے۔ ایک روایت کے مطابق حج بیت اللہ
سے مراجعت کے وقت ان کے ہمراہیوں کے علاوہ ایسے نادار لوگ بھی
کافی تعداد میں شریک سفر ہو گئے تھے جو مدت سے اخراجات سفر

پورے نہ ہونے کے باعث دیارِ عرب میں رُکے ہوئے تھے۔ اندازہ لگیئے کہ اس سفرِ عظیم میں خواجہ صاحب نے کیا کچھ خرچ کیا ہوگا۔ مرزا احمد اختر نے صرف چاچڑاں سے بمبئی تک کے اخراجات کا اندازہ ۳۶ ہزار روپے لگایا تھا۔ ظاہر ہے کل اخراجات تو لاکھوں تک پہنچ گئے ہوں گے۔ خواجہ صاحب نے اس سفر میں خیرات کا بھی ریکارڈ قائم کر دیا تھا۔ کہا جاتا ہے کہ ایک لاکھ روپے کے قریب انہوں نے مساکین و فقراء کو بطور خیرات دیئے تھے۔

حج پر روانہ ہونے سے پہلے خواجہ صاحب نے اپنے پیشرو مشائخ کی پیروی میں پہلے مزارات ہند کی زیارت کی۔ اجمیر شریف میں خواجہ معین الدین چشتی رحمۃ اللہ علیہ کی درگاہ پر گئے تو وہاں سجادہ نشین صاحب کی طرف سے خواجہ صاحب کی دستار بندی کی گئی اور خلعتِ فاخرہ ملا غرض جگہ جگہ ان اعزازات سے مشرف ہو کر انہوں نے اس دیار کا رُخ کیا جس کی محبت کا شعلہ مدت سے وہ اپنے دل میں دبائے ہوئے تھے کہتے ہیں جوں جوں سرزمین عرب نزدیک ہوتی جاتی تھی ان کے جذب و شوق میں بے حساب اضافہ ہوتا جاتا تھا۔ اسی جذب و کیف کے عالم میں جب درِ حبیب پر پہنچے تو ان پر وجد و بیخودی کی کیفیت طاری ہو گئی۔ مولانا غلام احمد اختر لکھتے ہیں۔

"آپ فرماتے تھے کہ جب میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے روضۂ مبارک پر پہنچا تو میں مواجہ شریف کے موقعہ پر ایسا مجذوب ہو گیا کہ مجھ کو

خیال آیا کہ اس سرزمین پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے قدم رکھے ہوں گے۔ بہتر ہے کہ میں اس سرزمین کو بوسہ دوں۔ اس خیال میں میری گردن نیچی ہو گئی تو ایک حبشی غلام نے جو میرے پیچھے کھڑا ہوا تھا مجھے گردن سے پکڑ کر زمین پر یہ کہکر دھکا دیا کہ مشرک آیا جب سر کے بل زمین پر گر پڑا تو میرے دل سے یہ لفظ نکلا اوا دلے خدا) میری کوشش کے سوا میرے کام بنانے والے خدا تیرا شکر اور میں نے جلد زمین پر بوسہ دیدیا اور اُٹھ کھڑا ہُوا۔"

محمد بشیر صاحب اختر نے نقش تعبیر میں یہ روایت درج کی ہے۔

"جب حضرت فرید مدینۃ الرسول میں داخل ہوتے ہیں تو عشق و مستی کی کیفیت سے بیخود ہو کر چاہتے ہیں کہ آستان بوسی کا فخر حاصل کر لوں۔ فوراً جھک جاتے ہیں پھر سر اٹھا لیتے ہیں۔ گویا اک گونہ تردد اور اضطراب ہے کسی پہلو کل نہیں پڑتی۔ آستان بوسی کی جرأت نہیں ہوتی۔ عجیب کشمکش کا عالم ہے آپ کی اس پریشانی کو دیکھ کر خادم نے عرض کیا حضرت جلد ہی آستان بوسی کر لیجیے۔ عوام کا ہجوم بڑھتا جا رہا ہے۔ آپ نے چشم پُرنم ہو کر فرمایا آستان بوسی کے لیے جب جھکتا ہوں تو دل سے آواز آتی ہے۔ فرید! حیا کر۔ تیری زبان اور دہان پلید ہے۔ محمد مصطفٰےؐ کا آستان طیب اور پاک ہے اس لیے ارادہ کی تکمیل میں محرومی نصیب ہے۔ کیا کروں یہ دل کے معاملے ہیں۔ کوئی اور کیا جانے۔"

ان روایات میں اگرچہ جزوی اختلاف ہے لیکن یہ نتیجہ ان دونوں روایات سے مرتب ہوتا ہے کہ خواجہ صاحب کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے بے پناہ عشق تھا۔ اگر انہوں نے اضطراری کیفیت میں آستان محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو بوسہ دیا تو وہ بھی عشق رسول کا نتیجہ تھا اور اگر مؤخر الذکر روایت کے مطابق آستان بوسی کی تکمیل نہ ہو سکی تو اس سے بھی ایک عاشق حقیقی کا کردار نمایاں ہوتا ہے۔ اور یہ پتہ چلتا ہے کہ خواجہ صاحب کورے عاشق ہی نہیں بلکہ آداب عشق سے بھی کماحقہ، واقف تھے۔ شاید میر تقی میر نے ایسے ہی با ادب عاشقوں کے لئے کہا ہے۔

دُور بیٹھا غبار میر ان سے
عشق بن یہ ادب نہیں آتا

خواجہ صاحب کی وفات

خواجہ صاحب نے تقریباً ۶۰ سال کی عمر میں ۶ ربیع الثانی ۱۳۱۹ھ بمطابق ۲۴ جنوری ۱۹۰۱ء بروز چہار شنبہ انتقال فرمایا۔ انتقال سے کچھ عرصہ قبل آپ مرضِ ذیل میں مبتلا ہو گئے تھے جو بالآخر جان لیوا ثابت ہوا۔ مولانا عزیز مرحوم لکھتے ہیں۔

"حضرت فرید بوقت سحر شب چہار شنبہ ۶ ربیع الثانی ۱۳۱۹ھ پلنگ پر سوئے ہوئے تھے دایاں ہاتھ سینے پر تھا۔ کمال استغراق کی حالت تھی اور شغل اسم ذات میں مصروف تھے۔ ضربات پے در پے جاری تھیں اسی حالت میں سرعتِ تنفس کا احساس کر کے حاضرین اور رکن الدین بھی روتا رہا۔

صبح کی نماز کے وقت دلاور خان خادم خاص نے دوائی پینے کے لئے
عرض کیا۔ آپ نے اس کی طرف دیکھ کر اشارہ فرمایا۔ اس نے دوائی
پلائی۔ اشراق کے وقت برکت علی ربابی نے کچھ شعر پڑھنے کی اجازت
چاہی تو اس وقت آپ نے انکار فرما دیا پھر عرض کیا پھر بھی منع فرمایا
ضعف کمال خواجہ بہت جلد بڑھنے لگا۔ حتیٰ کہ دوپہر کے وقت،
مایوسی کے آثار پیدا ہوتے اور مغرب کے وقت رحلت ہوئی۔"
محمد انور فیروز مرحوم نے گوہر شب چراغ میں یہ بھی لکھا ہے۔
"اگرچہ حالت امید افزا تھی مگر ہر دم انہیں یہی کہتے سنا گیا۔

گذر یا ویلا ہسن کھلن دا — آیا وقت فرید چلن دا
اوکھا پینڈا دوست ملن دا — جاں لباں پر آندی ہے

چنانچہ یہ پیشین گوئی پوری ہوئی اور وہ طوطیٔ ہزار داستان جسکی سحر بیانی
اور قادر الکلامی کی ہر طرف دھوم تھی ہمیشہ کے لئے خاموش ہو گیا۔ صادق الاخبار
نے جو اس زمانے میں ریاستی حکومت کا ترجمان تھا اس حادثہ فاجعہ پر ماتم
کرتے ہوئے ان الفاظ میں خواجہ صاحب کو خراج عقیدت پیش کیا۔

"حضرت ممدوح کمالات ظاہری و باطنی کے سبب دنیا میں مشہور تھے
آپ کے کریمانہ اخلاق کی تشریح حد امکان سے باہر ہے۔ آپ کی
بمثال فیاضی اور اتقا اور پارسائی کی مثال دنیا میں ملنی مشکل ہے حضرت
ممدوح میں منجملہ اور کمالات انسانی کے جو صفت جود و عطا کی تھی وہ
خاص قابلِ ذکر ہے کہ ہزار ہا آدمی دور و نزدیک کے آپ کے خوانِ نعما سے

وظائف پاتے تھے اور صدہا بیوائیں اور یتیم بچے اور شرفا آپ کے
نوالِ جود سے شکم سیر ہوتے تھے۔ آپ دیتے تھے اور شرماتے تھے۔
اور کسی سائل کو اپنے دروازے سے محروم نہ بھیجتے تھے۔ آپ کے
ہزار ہا مرید عرب۔ عجم۔ ترکستان اور ہندوستان میں موجود ہیں۔ اگر
غور کیا جائے تو ایسے صاحب کمال اب دنیا میں کہاں ہیں۔ درحقیقت
آپ کے انتقال پُرملال سے دنیا ایک بہت بڑے صاحب عرفان
عابد۔ زاہد اور ولیٔ کامل سے خالی ہو گئی"

"گوہر شب چراغ" میں سرکاری خطاط مولوی عزیز الدین مرحوم کی
مرقومہ تاریخ وفات بھی درج ہے جو یہاں نقل کی جا رہی ہے

مرشدِ شاہِ ما غلام فرید — الذی کان راضیاً برضاہ
شاہ ملک طریقت و عرفاں — صاحب العزو البہا والجاہ
نامیٔ غیر مثبت واحد — ذکرہٗ لا الہ الا اللہ
اعتقادش بدل خلائق را — وصفہٗ فی اللسان و الافواہ
ترک دنیا نمود و رحلت کرد — غمنا بالفراق و امغاہ
روح والاش چوں صعود نمود — سر من کان فی السما بلقاہ
ہر مقامے کہ بود ٹے فزود — قد علا قدرہٗ و ما اعلاہ
جائگاہش جوار رحمت باد — جعل اللہ جنتہٗ مثواہ

سال ترحیل او عزیز بگفت
جار مثوی لہٗ و طاب ثراہ
۱۳ ھ ۱۹

خواجہ صاحب بحیثیت شاعر

شاعری کا تصوف سے بڑا قدیم اور گہرا رشتہ ہے جو جذب وکیف کی مشترکہ اقدار پر قدیم الایام سے قائم چلا آتا ہے۔ مولانا جلال الدین رومیؒ کے متعلق مشہور ہے کہ وہ دوران سماع شوق و مستی میں رقص کرتے تھے اور ترنم سے شعر پڑھتے جاتے تھے۔ خواجہ قطب الدین بختیار کاکیؒ نے شعر پر جان دے کر تصوف میں شاعری کی عظمت کا سکہ بٹھا دیا۔ کہتے ہیں کہ سماع کی محفل میں یہ شعر گایا جا رہا تھا۔

کشتگانِ خنجر تسلیم را　　　ہر زماں از غیب جانے دیگر است

اس شعر نے ان پر ایک وجد کا عالم طاری کر دیا۔ جب نماز کا وقت آتا تو نماز پڑھ لیتے۔ پھر اسی شعر کو سنتے۔ چار شب و روز یہی حالت رہی۔ بالآخر پانچویں شب کو اسی عالمِ وجد میں انتقال فرمایا۔

تصوف سے شاعری کے اس گہرے ربط کا یہ نتیجہ نکلا کہ شاعری تصوف کا جزو بن گئی اور طبقہ صوفیا شعر گوئی کی طرف بالالتزام متوجہ ہو گیا۔ چنانچہ گذشتہ چھ سات سو صدی کے شعراء پر نظر ڈالی جائے تو ان میں اکثریت صوفی شعراء کی ہی ملے گی۔ بالخصوص فارسی شاعری میں جو مقام صوفی

شاعروں نے حاصل کیا وہ کسی غیر صوفی شاعر کے حصہ میں نہیں آسکا مثال کے طور پر ابوسعید ابوالخیر۔ سنائی۔ فریدالدین عطار۔ مولانا روم۔ شیخ سعدی اور حافظ شیرازی کے مقابلے میں کونسا شاعر پیش کیا جا سکتا ہے۔

یہی حال اردو شاعری کا ہے۔ اس کے بانی بھی صوفی شعراء تھے اور اسے منتہائے کمال کو پہنچانے میں اگر کلیتہً صوفی شعراء کا حصہ نہیں تو ان افکار و خیالات کا اس میں بڑا دخل ہے جو تصوف سے تعلق رکھتے ہیں۔ اردو کے علاوہ علاقائی زبانوں کی شاعری بھی جن میں سندھی۔ پنجابی اور ملتانی خاص طور پر قابل ذکر ہیں صوفی شعراء کی ہی مرہونِ منت ہے۔ چنانچہ سندھ میں شاہ عبداللطیف بھٹائی اور سچل سرمست۔ پنجاب میں مادھولال شاہ حسین اور بلھے شاہ اور ملتان میں بابا فریدالدین گنج شکر اور سید علی حیدر جیسے صوفی شاعر پیدا ہوئے جن کے طفیل ان علاقائی زبانوں کی شاعری پھلی پھولی

خواجہ غلام فرید بھی اسی سلسلے کی ایک مضبوط کڑی ہیں جنہوں نے صوفیائے کرام کی اس شعری روایت کو نہ صرف قائم رکھا بلکہ اپنی جدتِ طبع اور محنت شاقہ سے اس میں چار چاند لگائے۔ ان کی مادری زبان ملتانی یا بہاولپوری تھی اس لئے قدرتی طور پر انہوں نے اسی زبان کو اپنے اظہار خیالات و جذبات کا ذریعہ بنایا۔ ان سے قبل اس زبان کی شاعری کے باوا آدم انہیں کے ہمنام بابا فرید ہو گذرے تھے۔ جن کا کلام سکھوں کی گرنتھ کے طفیل اب بھی محفوظ ہے لیکن ان کے بعد تقریباً تین سو سال کا دور ایسا آتا ہے جس میں اس زبان کی شاعری نظر آتی ہے اور نہ کسی شاعر کا پتہ

چلتا ہے۔ یہ وہی خون آشامی اور افراتفری کا دور تھا جسے مورخ ملتان کے لیئے ایک عظیم المیہ سے تعبیر کرتے ہیں۔ اس طویل تعطل کے بعد شعروادب کے رشتے گیارھویں صدی میں آکر جڑتے ہیں اور ملتانی زبان کے شعراء میں مولوی لطف علی۔ عبدالحکیم اوچی۔ علی حیدر۔ حافظ جمال اور خواجہ حسن گامن شاعری کے آسمان پر اُبھرتے نظر آتے ہیں۔ ان میں موخر الذکر دو شاعر اپنی صوفیانہ شاعری کی وجہ سے مشہور ہیں علی حیدر فلسفہ عشق کے بیان میں اپنا ثانی نہیں رکھتے اور اول الذکر دو شاعروں کی شہرت کا راز انکی مثنوی گوئی میں مضمر ہے لیکن ان میں مولوی لطف علی کو جو شہرت اور مقبولیت حاصل ہوئی وہ عبدالحکیم اوچی کے حصہ میں نہیں آئی۔ ان کی مثنوی یوسف زلیخا کی علمی حیثیت ضرور بلند ہے لیکن اس میں مولوی لطف علی کی مثنوی سیف الملوک کا سا سوز اور اثر نہیں۔ یہ صحت زبان۔ محاورہ بندی۔ تشبیہات و استعارات اور سلاست بیان کے اعتبار سے بھی بڑی رفیع المرتبت ہے۔ کہتے ہیں کسی زمانہ میں اس کی اثر انگیزی کا یہ عالم تھا کہ اس کا سننے والا پری کے عشق میں اپنے ہوش و حواس کھو بیٹھتا تھا۔

شاعری کا یہ جادو مولوی لطف علی کے ساتھ ختم ہو گیا۔ ان کے بعد تقریباً ایک صدی کا دور ایسا آتا ہے جس میں کسی قابل ذکر شاعر کا سراغ نہیں ملتا۔ یہ تو ممکن نہیں کہ اس ایک سو سالہ دور میں ملتانی زبان کا کوئی شاعر پیدا ہی نہ ہوا ہو۔ لیکن یہ بات بدیہی ہے کہ جو شاعر اس دور میں پیدا ہوئے ان کی تخلیقات یا تو دستبرد زمانہ کی نذر ہو گئیں یا پھر ان میں قبولیت عامہ کی وہ صلاحیتیں نہ تھیں جو انہیں لوگوں کے سینوں میں محفوظ

رکھ سکتیں۔

اس ایک سو سالہ ادبی خلا کے بعد ایکایک امید کی ایک کرن نمودار ہوتی ہے۔ اور خواجہ غلام فریدؒ شاعری کے افق پر ایک ضو فشاں آفتاب کی مانند چمکتے نظر آتے ہیں۔ انہوں نے مثنوی گوئی کی قدیم روش سے ہٹ کر سرائیکی زبان کی شاعری کو فارسی نظم کے اتباع میں جملہ خیالات و جذبات کے اظہار کا ذریعہ بنایا۔ اور اس میں وہ تمام مضامین داخل کیے جو دیگر عالمی زبانوں کی شاعری کا طرۂ امتیاز ہو سکتے تھے اس غرض کے لیے انہوں نے اپنی زبان کی مشہور صنفِ سخن کافی کو منتخب کیا جس میں ہندی کے گیت اور اردو فارسی کی غزل مثنوی اور مستزاد وغیرہ سب کی گنجائش تھی۔

لفظ کافی اصل میں عربی قوانی کی بگڑی ہوئی شکل ہے جس میں پہلے ایک مطلع۔ ایک شعر یا ایک مصرعہ ہوتا ہے اور اس کے بعد تین تین چار چار مصرعوں کے بند ہوتے ہیں۔ اس کے علاوہ اردو فارسی غزل کی طرح یہ ہم قافیہ اشعار کا مجموعہ بھی ہوتی ہے۔

خواجہ غلام فریدؒ سے پہلے اور ان کے ہمعصر شعراء نے بھی کافیاں کہی ہیں۔ لیکن ان سب کافیوں کا موضوع صرف ایک یعنی یادِ خدا اور ترکِ دنیا کی ترغیب ہے۔ انہوں نے اس روش کے برعکس اس میں تغزل کا رنگ پیدا کرکے اسے اور جاذب توجہ بنا دیا۔ ان کی کافیوں میں تصوف کے مسائل۔ حسن و عشق کی واردات اور مناظر قدرت کی صحیح عکاسی کے ساتھ ساتھ ترنم و نغمگی کا ایسا حسین امتزاج ملتا ہے کہ سننے والے ان کی گوناگوں کیفیات سے

مسحور ہوئے بغیر نہیں رہ سکتے۔ وہ شاعری کو اہل دنیا کے لئے پیغام رسانی کا ذریعہ تصور کرتے تھے۔ چنانچہ انہوں نے اپنی شاعری کے ذریعہ ان خوابیدہ قوتوں کو جگانے کی کوشش کی جو انسانی کردار کی تعمیر میں مدد و معاون ہوتی ہیں۔ ان کی شاعری کی دوسری خوبی جس نے انہیں عوامی شاعر کا مرتبہ بخشا وہ ان کا مقامی رنگ اور سادگیٔ بیان ہے انہوں نے فلسفۂ زندگی اور تصوف کے باریک سے باریک مسئلوں کو بھی اتنے عام فہم اور آسان الفاظ میں ادا کیا ہے کہ عوام و خواص مساوی طور پر ان کے کلام سے مستفیض و لطف اندوز ہو سکتے ہیں "پنجابی زبان دا ادب تے تاریخ" میں یہ بالکل درست لکھا ہے کہ پنجابیوں کو شکسپیر کا ڈرامہ۔ حافظ کی غزل یا اقبال کی نظم اس قدر متاثر نہیں کر سکتی جتنی وارث کی ہیر۔ علی حیدر کا دوہا یا خواجہ فرید کی ایک کافی۔ وارث اور علی حیدر کے مقابلہ میں خواجہ صاحب کو یہ فضیلت بھی حاصل ہے۔ کہ اگر وارث کی ہیر اور علی حیدر کے دوہے صرف پنجاب کے علاقوں میں مشہور ہیں تو خواجہ فرید کی کافیاں صرف پنجاب کے ان علاقوں میں ہی مقبول نہیں جہاں پنجابی یا ملتانی زبان بولی جاتی ہے۔ بلکہ سرحد۔ بلوچستان اور سندھ کے بیشتر حصہ میں بھی انہیں بڑی مقبولیت حاصل ہے۔ ان علاقوں کا کوئی موسیقی دان ایسا نہ ہوگا جسے خواجہ صاحب کی کافیاں یاد نہ ہوں۔ قوال تو خاص طور پر خواجہ صاحب کی کافیاں محفلوں میں پڑھکر لوگوں کے لئے وجد و کیف کا سامان فراہم کرتے ہیں۔

خواجہ صاحب نے ملتانی زبان میں کافیاں لکھنے کے علاوہ سندھی۔ ہندی سنسکرت۔ اردو اور فارسی میں بھی کافی اشعار کہے ہیں۔ اردو کا تو ایک

دیوان بھی کافی عرصہ ہوا طبع ہوا تھا جواب ناپید ہے۔ البتہ فارسی کی چند غزلوں کے علاوہ کسی مکمل مجموعۂ کلام کا پتہ نہیں چلتا۔ جہانتک سندھی۔ ہندی اور سنسکرت کے کلام کا تعلق ہے انکے چند نمونے دیوان فرید میں ملتے ہیں جو مولوی عزیزالرحمٰن مرحوم نے مرتب کیا تھا۔ اس دیوان میں خواجہ صاحب کی ۲۷۲ کافیاں ہیں۔ جن کا اردو ترجمہ بھی ساتھ ساتھ دیا گیا ہے۔

خواجہ صاحب کی زبان

جس زبان میں خواجہ غلام فرید نے کافیاں کہی ہیں اسے بہاولپوری یا ملتانی زبان کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔ لیکن یہ بات اکثر ابہام پیدا کرتی ہے کہ ملتانی اور بہاولپوری ایک ہی زبان کے دو نام ہیں تو ان کے لئے کوئی ایک نام کیوں تجویز نہیں کیا گیا۔ نیز بہاولپوری اور ملتانی ایک ہی زبان کے دو نام ہیں تو ان میں اور پنجابی زبان میں کیا فرق ہے۔

پنجابی زبان کے بعض محققین ملتانی یا بہاولپوری زبان کو پنجابی کی ایک شاخ ثابت کرتے ہیں اور اس سلسلہ میں الفاظ کے ماخذ اور لب و لہجہ کو اپنی تحقیق کی بنیاد قرار دیتے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ دلی۔ انبالہ سے اٹک۔ نوشہرہ تک اور بہاولپور سے ہزارہ تک سارا پنجاب تھا۔ اور چونکہ بولی ہر بارہ کوس کے بعد بدل جاتی ہے اس لئے وہ ہمہ گیر زبان جو اصل میں پنجابی تھی علاقائی لب و لہجہ کے تغیر کی وجہ سے مختلف علاقوں میں مختلف انداز میں بولی جانے لگی اور ان علاقوں کے نام پر ان کا نام ملتانی۔ بہاولپوری وغیرہ رکھدیا۔

اہلِ سندھ اس رائے کے برعکس یہ خیال ظاہر کرتے ہیں کہ سندھی، ملتانی یا بہاولپوری زبان کا منبع ہے۔ اور چونکہ بہاولپور اور ملتان سلطنتِ سندھ کے

تابع فرمان تھے اس لئے یہاں جس زبان نے جنم لیا اس کا خمیر حکمران علاقہ کے زیر اثر سندھی زبان سے اٹھا۔

اس خیال کی تائید بہاولپور کے محققین ادب بھی کرتے ہیں۔ چنانچہ محمد بشیر احمد ظامی نے اپنی کتاب "بہاولپوری ملتانی زبان و ادب" میں لکھا ہے۔

"سندھی زبان سے اس کا تعلق اور اشتراک بہت گہرا ہے۔ بلکہ ان دونوں میں یگانگت نسبی و وحدت خاندانی کے بے شمار شواہد موجود ہیں"

بہاول پوری اور ملتانی کا سندھی زبان سے اشتراک تو بہاولپور اور ملتان والے مانتے ہیں۔ لیکن یہ بات انہیں تسلیم نہیں کہ یہ پنجابی کی ایک شاخ ہے۔ بلکہ وہ پنجابی کو بھی ملتانی یا بہاولپوری کی ہی ایک بدلی ہوئی شکل بتاتے ہیں ان کا خیال ہے کہ آریائی قوم کے جس گروہ نے سب سے پہلے وادی سندھ کو فتح کیا تھا وہ اپنے ساتھ ایک زبان بھی لایا تھا اور چونکہ اس گروہ نے اپنا پایۂ تخت ملتان کو بنایا تھا اس لئے اس کی مناسبت سے اس زبان کا نام ملتانی پڑ گیا اور جو جو علاقے اس سلطنت کے ماتحت تھے وہاں یہی زبان مروج و عام ہو گئی۔ چنانچہ ان کا دعوےٰ ہے کہ یہ زبان نہ صرف بہاولپور۔ ملتان۔ مظفر گڑھ ڈیرہ غازی خان۔ ڈیرہ اسماعیل خان اور جنوب مشرقی بلوچستان، میں بولی جاتی ہے۔ بلکہ سابق صوبہ سرحد کے گرد و نواح۔ ریاست چترال کے انتہائی علاقہ کافرستان اور کشمیر میں بھی اس زبان کا سراغ ملتا ہے۔

ملتانی زبان کی اس ہمہ گیری کے علاوہ اس کا کل تخلیق جو ۔۔۔ سے شروع

ہو کر ۹۵۳ء تک جاری رہا۔ اس بات کا بیّن ثبوت ہے کہ یہ زبان کسی دوسری زبان کی شاخ نہیں۔ بلکہ بذاتِ خود ایک جداگانہ حیثیت رکھتی ہے۔ اس میں جس کثرت سے سنسکرت۔ عربی۔ فارسی اور پشتو زبان کے الفاظ ملتے ہیں اتنے پنجابی یا کسی اور علاقائی زبان میں نہیں ملتے۔ اس کی وجہ ملتان کی وہ سیاسی اہمیت ہے جو اسے مختلف قوموں کی حکومتوں کے پایۂ تخت بننے کی وجہ سے حاصل تھی۔ یہاں مختلف اوقات میں جن جن قوموں نے حکومت کی انہوں نے اپنی زبان کے اثرات بھی یہاں کی زبان پر چھوڑے۔ چنانچہ ملی قوم کا اقتدار ان کے ہاتھ سے گیا تو بدھوں نے یہاں کی زبان میں پراکرت کی آمیزش کی۔ ۵۰ء میں بکرما جیت کی فتح کے بعد پراکرت نے سنسکرت کا رنگ اختیار کر لیا۔ سنسکرت کے قدیم الفاظ مثلاً روگ۔ مند۔ پتر۔ گل۔ اس۔ لون وغیرہ آج بھی ملتانی زبان میں موجود ہیں۔ البتہ زمانہ کے تغیّرات نے کچھ الفاظ کی شکل تبدیل کر دی جیسے تدانی سے تداں۔ کنپ سے کبنھ اور کدھاں سے کڈاں بن گئے۔ ۴۸۱ء تک ملتانی زبان کی شاعری بھی سنسکرت آمیز رہی۔ ۷۱۲ء میں جب محمد بن قاسم نے ہندوستان میں اپنی فتوحات کا آغاز کیا اور سندھ سے ملتان تک کا علاقہ اس کے زیرِ نگیں آگیا تو یہاں کی زبان میں ایک نئی تبدیلی رونما ہوئی۔ حکمرانوں کی زبان جو عربی تھی اس کے الفاظ اس زبان میں داخل ہونے شروع ہو گئے۔ تقریباً دو صدی تک یہ عمل جاری رہا ۹۵۳ء میں جب مشہور سیاح ابن حوقل بغدادی یہاں آیا ہے۔ تو اس وقت اگرچہ عوام ملکی و تجارتی معاملات اپنی زبان میں کرتے تھے۔ لیکن عدالت اور امراء کی زبان

عرب ہونے کی وجہ سے ان کے اثرات اس زبان پر قائم ہو رہے تھے۔ نویں صدی عیسوی کے آخر میں دیلمیوں کا وادئ سندھ بشمول ملتان پر تسلط ہوا تو یہاں فارسی زبان کا دور دورہ ہوا اور اس کے زیر اثر فارسی کے متعدد الفاظ اس زبان میں داخل ہو گئے۔ یہاں تک کہ جب پٹھانوں کا دور آیا تو ملتانی زبان نے پشتو کے الفاظ بھی اپنے میں جذب کر لیئے۔ مثال کے طور پر پشتو کے الفاظ "سُتم" بہ معنی آرام کرنا۔ شوم بمعنی بخیل۔ یالی بمعنی سٹ کا تھال اور بوٹی بمعنی خوشبودار گھاس۔ ملتانی زبان میں آج بھی مستعمل ہیں۔

ملتانی زبان کی جداگانہ حیثیت بعض دیگر تاریخی شواہد سے بھی ثابت ہوتی ہے۔ مثلاً مشہور سیاح ابن حوقل ملتان کی زبان کو ملتانی بتاتا ہے آئین اکبری میں بھی اس کا نام ملتانی لکھا ہے۔ علاوہ ازیں امیر خسرو جنہوں نے خود اس زبان میں شعر کہہ کر اس کی عظمت میں اضافہ کیا ہے۔ اسے ملتانی کے نام سے ہی یاد کرتے ہیں۔ اگر یہ زبان پنجابی کی شاخ ہوتی تو یہ حضرات ضرور اس کی نشاندہی کرتے۔

جہاں تک سندھی اور ملتانی کے ربط و اشتراک کا تعلق ہے۔ ان علاقوں کی سیاسی تاریخ بتاتی ہے کہ یہ ربط و اشتراک ناگزیر تھا۔ لیکن اس کے باوجود ملتانی نہ صرف ایک علیحدہ زبان کی حیثیت سے پروان چڑھتی رہی بلکہ علمی و ادبی اعتبار سے اسے سندھی پر تفوق حاصل رہا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ تہذیب و ثقافت کا جو رچاؤ سرزمین ملتان کے حصہ میں آیا تھا وہ برس ہا برس تک سندھ کو میسر نہیں آیا۔ علاوہ ازیں ملتان عہد ماقبل مسیح میں بھی سندھ

سندھ کا قبلہ سمجھا جاتا تھا اور اس کے بعد جب مسلمانوں کا دورِ حکومت آیا تو بھی زیادہ تر یہی سب کا دارالحکومت قرار پایا۔ علماء و صلحائے نے بھی سندھ کی بجائے یہیں کا رُخ کیا۔ یہی وجہ ہے کہ سولھویں صدی عیسوی کے آغاز تک سندھی میں ادبی تخلیقات کا سراغ نہیں ملتا۔ شاہ عبداللطیف بھٹائی جن کا زمانہ ۱۶۸۹ء تا ۱۷۵۲ء ہے۔ سندھی کے پہلے شاعر کی حیثیت سے سامنے آتے ہیں۔ اس کے برخلاف ملتانی زبان میں شاعری کی ابتدا پانچویں صدی ہجری میں ہو چکی تھی۔ بابا فریدالدین گنج شکر کا نام اس سلسلہ میں سرفہرست ہے بابا فریدالدین گنج شکر جو ملتانی زبان کے شاعر تھے انہیں کو اہل پنجاب بھی پنجابی کا پہلا شاعر مانتے ہیں۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ جو تقدم اور افضلیت ملتانی زبان کو حاصل ہے وہ پنجابی یا سندھی کو حاصل نہیں۔ اور اس اعتبار سے سندھی یا پنجابی کو ملتانی زبان کا ماخذ سمجھنا غلط ہے۔

نام کا اختلاف ملتانی زبان کا نام بھی اختلاف سے خالی نہیں۔ اہل بہاولپور اسے بہاولپوری یا ریاستی کا نام دیتے ہیں دوسرے علاقوں میں یہ مظفر گڑھی اور جھنگوی کے نام سے مشہور ہے۔ نواحِ سندھ اور چولستان کے علاقے میں اس زبان کو سرائیکی سے موسوم کیا جاتا ہے وجہ الذکر لفظ کی وجہ تسمیہ کا بیان یہاں خالی از دلچسپی نہ ہو گا۔

محمد بشیر احمد ظامی اپنی کتاب "بہاولپوری ملتانی زبان و ادب" میں لکھتے ہیں

"بعض کا قول ہے کہ پرانے زمانے میں اس علاقے کی بری اور بحری شاہراہوں پر جو سرائیں آباد تھیں۔ ان سب کا انتظام بالعموم ملتانیوں

کے ہاتھ میں تھا بلکہ دہلی سے لے کر ایران تک کی سراؤں کے
منتظمین یہی تھے اور یہ لوگ اپنے عملے سمیت بہاولپوری ملتانی بولتے
تھے اور اسی میں گفتگو کرتے تھے۔ بس اس زبان کے کارواں سراؤں
میں مروج ہونے کی وجہ سے سندھ کے لوگ اسے سرائیکی کہنے
لگے"

مذکورہ بالا بیان سے جہاں لفظ سرائیکی کی وجہ تسمیہ معلوم ہوتی ہے وہاں اس حقیقت کا سراغ بھی ملتا ہے کہ سرائیکی جسے ملتانی۔ بہاولپوری۔ مظفرگڑھی اور جھنگوی وغیرہ ناموں سے یاد کیا جاتا ہے۔ اس کی تخلیق کس طرح عمل میں آئی۔ جہانتک اس مفروضے کا تعلق ہے کہ بری اور بحری شاہراہوں پر جو کارواں سرائیں آباد تھیں ان کے منتظمین ملتان کے رہنے والے تھے اور وہ اپنے عملے سمیت بہاولپوری ملتانی بولتے تھے۔ اس میں حسن ظن کا زیادہ دخل نظر آتا ہے۔ البتہ کارواں سرائوں میں بولی جانے والی زبان کا نام سرائنگی پڑ جانا حقیقت کے بہت قریب معلوم ہوتا ہے۔ ظاہر ہے جو کارواں سرائیں بری اور بحری شاہراہوں پر واقع تھیں ان میں ٹھہرنے والے زیادہ بدیسی تاجر ہی ہوں گے جہاں ان تاجروں کو اپنی کاروباری ضروریات کے سلسلہ میں اس علاقے کے رہنے والوں سے گفت و شنید کے لئے ان کی زبان کے الفاظ سیکھنے پڑتے ہوں گے۔ وہاں اس علاقہ کے رہنے والے بدیسی تاجروں کی زبان کے الفاظ ۔۔۔ ۔۔۔ ۔۔۔ ۔۔۔
۔۔۔ ۔۔۔ ۔۔۔ سیکھ کر اظہار مطالب کی

کوشش کرتے ہوں گے۔ اس اختلاط اور وقتی ضرورت نے یہاں بولی جانے والی زبان میں کوئی خاص تبدیلی پیدا کی ہو گی۔ اس وقت اس زبان میں فارسی اور عربی کے الفاظ کی جو بہتات ملتی ہے وہ انہیں حالات کا نتیجہ معلوم ہوتی ہے۔

اب سوال یہ رہ جاتا ہے کہ سرائیکی کا نام ملتانی یا بہاولپوری کیسے پڑ گیا۔ اس کا جواب محمد بشیر احمد ظامی نے اپنی کتاب "بہاولپوری ملتانی زبان و ادب" میں اس طرح دیا ہے۔

"مطالعہ و مشاہدہ سے ظاہر ہے کہ کسی ملک یا علاقے کی زبان اس ملک، علاقہ یا اس علاقے کے رہنے والے قبیلہ۔ قوم یا شہر کے نام کے ساتھ منسوب و موسوم ہوتی ہے اور وہاں کے باشندے اس زبان کو اسی نام سے پکارتے اور اسے پسند عام و قبولیت تام کا شرف بخشتے ہیں پھر وہ نام خاص بد عام میں ہر دلعزیزی حاصل کر کے شرف تعمہ کا مالک بن جاتا ہے"

اس نظریئے کی تائید زبان اردو کے مختلف ناموں کے تاریخی مطالعہ سے بھی ہوتی ہے۔ جس طرح فوجی کیمپوں اور فرودگاہوں میں بولی جانے والی زبان اردو کہلائی اور اہل دہلی نے اس کا نام دہلوی۔ اہل دکن نے دکنی اور اہل گجرات نے گجراتی یا گوجری رکھدیا تھا۔ اسی طرح کاروان سراؤں میں بولی جانے والی زبان سرائیکی کا نام اہل ملتان نے ملتانی۔ اہل بہاولپور نے بہاولپوری اور جھنگ اور مظفر گڑھ والوں نے جھنگوی اور مظفر گڈھی رکھ دیا۔ اب اردو تو اپنی ارتقائی منازل طے کرنے کے ساتھ ساتھ اپنے علاقائی ناموں

کو ختم کر چکی ہے لیکن سرائیکی کے مختلف علاقائی نام اب بھی باقی ہیں۔ البتہ ان
یں ملتانی کا نام جسقدر مقبول اور مشہور ہوا ہے اتنی مقبولیت اور شہرت اس
کے دوسرے ناموں کو نہیں ہوئی۔ اس کی وجہ ملتان کی وہی سیاسی و تمدنی
اہمیت ہے جس کا سطور بالا میں ذکر کیا جا چکا ہے۔

ملتانی زبان کی خصوصیات

کسی اہلِ زبان سے جب اس کی زبان کے متعلق دریافت کیا جائے تو وہ اس کی تعریف میں
زمین آسمان کے قلابے ملا دیتا ہے۔ چنانچہ مجھے یاد ہے جب میں نے ملتانی زبان
کی خصوصیات کے متعلق اپنے ایک بہاولپوری بھائی سے استفسار کیا تو انہوں نے
کہا کہ اگر بحیثیت مسلمان عربی کا تقدس میرے پیشِ نظر نہ ہوتا تو میں یہ کہتا کہ جو
خوبی ہماری زبان میں ہے وہ عربی زبان میں بھی نہیں

یہ بات بڑی جذباتی قسم کی معلوم ہوئی تھی اس وجہ سے میں نے اس موضوع
پر اپنے بھائی سے مزید گفتگو نہ کی لیکن جب زبان پر تحقیق کی ضرورت لاحق
ہوئی اور میں نے اس زبان کے الفاظ۔ محاورے اور تراکیب پر غور کیا تو مجھے
بھی اس کی بلاغت کا قائل ہونا پڑا۔ یہ زبان عربی کی طرح طویل سے طویل
مضمون کو نہایت اختصار و ایجاز کے ساتھ ادا کرنے کی صلاحیت رکھتی ہے۔ نیز
اس میں ذخیرۂ الفاظ کی فراوانی کے ساتھ ساتھ مترادف و متبادل الفاظ کی
بھی بہتات ہے۔ مثال کے طور پہ لفظ درد جو اردو میں تقریباً ہر عضو انسانی
کے درد اور تکلیف کے لئے استعمال ہوتا ہے۔ ملتانی زبان میں اس کے لئے
اتنے ہی الفاظ ہیں جتنے قسم کا یہ درد ہوتا ہے۔ عربی میں ایسی صدہا مثالیں ملتی

ہیں کہ مفرد الفاظ پورے جملے کا کام دیتے ہیں مثلاً "قلتہ جس کے معنی ہیں" میں نے اس کو کہا" اس میں فاعل۔ فعل اور مفعول تینوں کلمات موجود ہیں۔ یہی ایجاز ملتانی زبان میں بھی ملتا ہے۔ جس مفہوم کو عربی میں "قلتہ" کے مفرد لفظ نے پورا کیا ہے اسی مفہوم کو ملتانی زبان میں "اکھیونیس" سے پورا کیا جا سکتا ہے۔

ملتانی زبان ملکی سیاست کے تغیرات کے ساتھ ساتھ نشو و نما پاتی رہی ہے اس لئے اس کے دامن میں عربی۔ فارسی۔ ہندی اور سنسکرت کے علاوہ ان تمام زبانوں کے الفاظ بھی شامل ہیں جو مختلف حکمرانوں کے ساتھ ساتھ عہد بہ عہد یہاں رائج ہوتی رہی ہیں۔ اس صورت حال نے اس زبان کی ثروت میں ہی اضافہ نہیں کیا اسے سہل الحصول اور عام فہم بھی اتنا کر دیا ہے کہ اجنبی سے اجنبی شخص بھی اگر اس میں گفتگو نہیں کر سکتا تو اس کے مطالب ضرور اخذ کر سکتا ہے۔ خاص طور پر اہل اردو کے لئے اس زبان کا سمجھنا کوئی مشکل نہیں کیونکہ اس میں بے شمار ایسے الفاظ موجود ہیں جو معمولی سے تغیر کے ساتھ اردو میں بولے جاتے ہیں۔ علاوہ ازیں اس کے الفاظ کی ساخت اور ان کے مخارج کوہستانی زبانوں کی طرح کرخت اور بے ہنگم نہیں بلکہ ان میں اس درجہ لوچ اور ملائمت ہے کہ سننے والے پر اس کے بڑے خوشگوار اثرات مرتب ہوتے ہیں۔ اس سلسلہ میں محمد بشیر احمد ظامی نے اپنی کتاب "بہاولپوری ملتانی زبان و ادب" میں ایک واقعہ درج کیا ہے جو خالی از دلچسپی نہ ہوگا۔ وہ لکھتے ہیں۔

"پنجاب سے آئے ہوئے ایک بہت بڑے فوجی افسر کے متعلق

یہاں یہ مشہور ہے کہ جب شروع شروع میں وہ یہاں آیا تو بہاولپوری فوجیوں میں تساہل پسندی کو دیکھ کر سخت برہم ہوتا تھا اور سست الوجود ملازمین کو سخت سزائیں دیتا تھا۔ کچھ عرصہ بعد لوگوں نے دیکھا کہ اس کا وہ جوش ٹھنڈا پڑ گیا ہے اور اس نے کام چور اور سست الوجود ملازمین کو سخت سزائیں دینا موقوف کر دیا ہے۔ ایک دن اس کے کسی بے تکلف دوست نے اس سے اس کی وجہ پوچھی تو اس نے جواب دیا کہ مجھ پہ یہاں کے لوگوں کی زبان کی حلاوت اور شیریں بیانی کا جادو چل گیا ہے۔ جب یہاں کا کوئی قصوروار فوجی اپنے دل آویز انداز میں مجھ سے کہتا ہے کہ "سوہنا سائیں! دل ہیں ایہوں کیناں کہ ہساں۔ جیویں ثنالا۔ اتھ واری ہیڑا اے قصور معاف کر ڈیو" تو اس حلاوت بھری اپیل کو سن کر میں اسے معاف کیے بغیر نہیں رہ سکتا۔"

ملتانی زبان کی اس حلاوت اور مذکور الصدر فصاحت و بلاغت کے باوجود یہ عجیب اتفاق ہے کہ اسے ضبط تحریر میں لانے کے لئے اس کے قواعد بہت عرصہ بعد مرتب کیے گئے۔ اول اول سندھی کی طرح اسے بھی خطِ نسخ میں لکھا جاتا تھا۔ لیکن بعد میں ایرانی الاصل سلاطین کے اثر سے خطِ نسخ کی بجائے خطِ نستعلیق مروّج ہو گیا۔ آج بھی ملتانی زبان خطِ نستعلیق میں لکھی جاتی ہے۔ لیکن اس میں یہ نقص شروع سے محسوس کیا جاتا ہے کہ اس زبان کی مخصوص صوتیات کے لئے جب تک خاص قسم کی علامات مقرر نہ کی

جائیں انہیں صحیح طریقے سے نہیں لکھا جا سکتا۔ چنانچہ اس زبان کے مصلحین نے اس سلسلہ میں کچھ کامیاب تجربے کئے ہیں۔ اور اس کی مخصوص اصوات اور لہجوں کو ظاہر کرنے کے لئے اردو حروف تہجی پر بعض علامات کا اضافہ کیا ہے جس سے یہ نقص کسی حد تک دُور ہو جاتا ہے۔ مثلاً ملتانی لہجے کی ب کی صورت خطی "ٻ" ہے۔ جیم کی صورت خطی "ڄ" ہے اور نون آمیختہ جیم یوں لکھی جاتی ہے "ڃ" محمد بشیر احمد ظامی نے یائے خفی الصوت کا اضافہ کر کے ملتانی زبان کی تحریری مشکلات میں اور کمی کر دی ہے وہ لکھتے ہیں کہ اردو اور پنجابی زبان میں لفظ لائیاں۔ بابیاں اور کابیاں کے حروف یا کی آواز کچھ اور ہے اور بہاولپوری زبان میں کچھ اور ہے۔ اس فرق کے اظہار کے لئے یائے خفی الصوت وضع کی گئی ہے اور اپنی زبان کے ان تمام مخصوص حروف کو اپنانے کے لئے علامت کے طور پر ان پر اس طرح کا (٥) ایک گول نشان تجویز کیا ہے اور اسے بہاولپوری زبان کے مخصوص حروف کی علامت قرار دیا ہے۔ بہر حال ان ترمیموں کے بعد اب اس زبان کی صوتی لطافتوں کو بھی ضبط تحریر میں لانا آسان ہو گیا ہے۔

رسم الخط کی اس دشواری کے باوجود ملتانی زبان کا علمی و ادبی پہلو بڑا روشن ہے۔ اور اس اعتبار سے یہ سارے مغربی پاکستان کی واحد زبان ہے جس میں پانچویں صدی ہجری سے تصنیف و تالیف کا باقاعدہ آغاز ہو چکا تھا افسوس ہے یہ ادبی و علمی ذخیرہ ملتان کی سیاسی تلاطم خیزیوں میں بہہ گیا۔ تاہم نظم کے جو نمونے گذشتہ ادوار کے اب تک محفوظ ہیں ان سے اس کی عظمت کا اندازہ لگانا مشکل نہیں۔

اس زبان کی نظم میں شاعری کی تمام اصناف مثلاً قصیدہ۔ مرثیہ۔ مثنوی رباعی اور غزل موجود ہیں۔ علاوہ ازیں ایک اور صنف جو "دوہڑے" کے نام سے موسوم کی جاتی ہے اس زبان میں مروج ہے یہ نظم و نثر مسجع کی درمیانی شکل ہے جو فی البدیہہ کہی جاتی ہے۔

چونکہ ملتانی زبان پر ہندی کا اثر قدیم الایام سے ہے اس لئے اس کی شاعری میں بھی ہندی کا تتبع پایا جاتا ہے۔ مثال کے طور پر جس طرح ہندی میں مرد کی بجائے عورت اظہار عشق کرتی ہے اسی طرح ملتانی زبان کی شاعری میں بھی عورت عاشق اور مرد معشوق ہوتا ہے۔ اس سلسلہ میں خواجہ غلام فرید صاحب نے جو توجیہہ فرمائی ہے وہ ملاحظہ ہو۔

"بعد ازاں حضور خواجہ ابقاہ اللہ تعالیٰ بقائہٗ فرمودند کہ در عرب شریف مرداں عاشقاں اند و زناں معشوقاں۔ چنانچہ مجنوں عاشق و لیلیٰ معشوقہ بود۔ فلاں عاشق و سلمیٰ معشوقہ بود۔ پس ازیں جہت شاعران عرب شریف خود را مرد کہ عاشق بود اعتبار کردہ کلام در شعر از طرف مرد گفتہ اند و در ملک فارس مردان و زنان ہر دو عاشقان و معشوقاں بودہ اند بنا براں در کلام شعراء فارس فرقے از زن و مرد نیست و در کشور ہندوستان و پنجاب و سندھ زنان عاشقان بودہ اند و مردان معشوقان چنانچہ سری کرشن جی صاحب معشوق بود و زنان او عاشقاں وے بودند۔ و میاں رانجھا معشوق بود و مائی ہیر عاشق اوست و مرزا معشوق بود و صاحباں عاشق او بود و دیگر کساں ہم بسیار بودہ اند۔ فلہذا شاعران ایں دیار اگرچہ مرد اند

خود را بزنان تعبیر کردہ کلام در اشعار چناں گفتہ اند کہ گویا زنان گفتہ است"

(ملفوظات حصہ چہارم صفحہ ۲۷۲)

خواجہ صاحب کی کافیوں میں بھی عاشق کے لئے وہی اوصاف ملحوظ رکھے گئے ہیں جو ایک عورت کے لئے مخصوص ہیں۔ اور تلمیحاً عاشق کے لئے انہی مصائب اور مشکلات کو سدِ راہ قرار دیا گیا ہے۔ جو ایک عورت کو پیش آسکتی ہیں۔ چنانچہ سسی اور سوہنی وغیرہ نام عاشق کے لئے اور پنہوال۔ پنوں۔ ڈھولہ وغیرہ معشوق کے واسطے استعمال کیے گئے ہیں۔

خواجہ صاحب کی شاعری

کہتے ہیں کہ شاعر بنتا نہیں پیدا ہوتا ہے۔ اور جن لوگوں کو یہ فطری صلاحیت قدرت کی طرف سے ودیعت ہوتی ہے وہ خارجی قوتوں کی مدد سے اس قدرتی عطیہ کا خود بھی فائدہ اٹھاتے ہیں اور دوسروں کو بھی اس سے مستفیض کرتے ہیں۔ کسی بڑے شاعر کی پہچان بھی یہی ہے۔ کہ اس کا کلام محض اس کی ذات تک ہی محدود نہ ہو بلکہ اس کے پڑھنے اور سننے والے بھی اس میں دلچسپی لیں۔

خواجہ غلام فرید پیدائشی شاعر تھے۔ زبان چلتے ہی ان کے منہ سے جو فقرہ نکلا وہ ایک مصرعۂ موزوں تھا۔ گذشتہ اوراق میں ان کی رسم۔ بسم اللہ کا حال لکھا جا چکا ہے جس سے یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں کہ "آکھ غلام فرید الف" کی ساخت نے ایک معصوم بچے کو کس طرح اپنی طرف کھینچا اور اس کی موزونیت نے اسے کس درجہ گم کر دیا کہ وہ بار بار اسی فقرے کو دوہراتا رہا۔

عام طور پہ یہ بھی ہوتا ہے کہ اگر ماحول سازگار نہ ہو تو بعض فطری صلاحیتیں بھی کچھ عرصہ کے بعد معدوم ہو جاتی ہیں۔ لیکن حسن اتفاق سے خواجہ صاحب کو ماحول بھی ایسا میسر آیا جس میں ان کی شاعری کو پنپنے میں مدد ملی۔ ان کے خاندان میں شاعری کا چرچا پہلے سے چلا آرہا تھا۔ خاص طور پر ان کے بڑے بھائی خواجہ

غلام فخرالدین جن کے آغوشِ تربیت میں وہ پروان چڑھے اپنے دور کے خوش فکر اور نغز گو شاعر تھے۔

اس سازگار ماحول میں خواجہ صاحب کو وہ اسباب بھی مہیا ہو گئے جو شاعری کی ترقی میں لازمی اجزاء کی حیثیت رکھتے ہیں اور جنہیں مذکورہ بالا سطور میں خارجی قوتوں سے تعبیر کیا گیا ہے ان خارجی قوتوں سے ہماری مراد علوم متداولہ کی تحصیل ہے۔ اگر ایک شاعر اشیاء کی ماہیت سے بے خبر اور مطالعۂ کائنات سے عاری ہو تو وہ دنیا کو کیا درس دے سکے گا۔ اظہار جذبات کے لئے بھی سلیقے اور توازن لفظی کی ضرورت ہوتی ہے جو علمی بصیرت کے بغیر ممکن نہیں۔ خواجہ صاحب اس دولت سے بھی مالا مال تھے۔ انہیں جہاں قلب پر سوز اور نگاہ نکتہ رس عطا ہوئی تھی وہاں علم کی روشنی بھی بے حد و حساب ان کے حصہ میں آئی تھی۔ ظاہر ہے جب شاعری ان اجزاء سے مرکب ہو گی تو وہ محض آہ اور واہ پر ختم نہیں ہو گی بلکہ لوگوں کے لئے غور و فکر کا سامان بھی فراہم کرے گی۔

جس شاعری میں فکری عناصر شامل ہوں وہ پیغام کی حامل سمجھی جاتی ہے اور جب کوئی شاعر اپنے وارداتِ قلب کو فکری سانچے میں ڈھال کر لوگوں کو غور و فکر کی دعوت دیتا ہے تو اس کی حیثیت ایک ریفارمر اور مصلح کی سی ہو جاتی ہے۔ خواجہ غلام فرید جن کے کلام میں جذبات و خیالات کی ہم آہنگی اور واردات و افکار کا ارتباط ہے شاعر سے زیادہ ریفارمر اور ریفارمر سے زیادہ شاعر تھے ان کے کلام میں جہاں جذبات دریا

کی موجوں کی طرح مچلتے نظر آتے ہیں۔ وہاں فکر و نظر کے صحراؤں کا سکوت بھی ملتا ہے۔ لیکن نہ جذبات کی روانی "دل والوں" کو نذرِ طوفان کرتی ہے اور نہ کوئی فکر و نظر کی پہنائیوں میں گم ہو کر منزل مقصود سے بھٹکنے پاتا ہے۔ ان کا کلام بیک وقت خون میں حرارت بھی پیدا کرتا ہے اور دماغ کی خوابیدہ قوتوں کو بیدار بھی کرتا ہے۔

کہتے ہیں کہ جب تک دل آتش عشق میں نہ جلے کوئی شاعر۔ شاعر نہیں بن سکتا۔ بہ الفاظ دیگر شاعری محتاج ہے دولتِ عشق اور دل گرفتگی کی۔ اگر اس مفروضہ کو صحیح مان لیا جائے تو خواجہ غلام فرید اپنے دور کے ملک الشعرا قرار پاتے ہیں۔ ان کا خمیر ہی عشق و محبت سے اٹھایا گیا تھا۔ اسی کی تعلیم انہیں تصوف کے مکتب میں ملی جہاں سے فارغ التحصیل ہونے کے بعد وہ تمام دنیا کو آخر دم تک عشق کا ہی درس دیتے رہے۔

خواجہ صاحب کے معتقد ان کو عاشق حقیقی بتاتے ہیں اور اس میں کوئی شک و شبہ بھی نہیں کہ وہ اس باب میں فنا فی اللہ کے مقام پر پہنچے ہوئے تھے لیکن جہاں تک عشق مجازی کا تعلق ہے اس راہ کی دشواریوں سے بھی وہ آشنا تھے اور یہ ان کا کمال عشق تھا کہ یہاں بھی منزل رسی میں ان کے پاؤں کہیں نہ ڈگمگائے۔ ان کے کلام میں مجازی اور حقیقت ہر دو قسم کے عشق کا سراغ ملتا ہے۔ وہ جب کالی زلفوں والے نرم و نازک محبوب کا ذکر کرتے ہیں تو اس میں بھی بلا کی جذبات نگاری ہوتی ہے اور جب حسن ازل کی نورانی شعاعیں ان کے قلب مضطر پر منعکس ہوتی ہیں تو اس وقت بھی ان کے اشعار

دہکتے ہوئے انگارے معلوم ہوتے ہیں۔ غالباً انہیں کیفیات سے متاثر ہو کر ایک بار علامہ اقبال نے کہا تھا۔

"جس قوم میں فرید اور اس کی شاعری موجود ہے۔ اس قوم میں عشق و محبت کا موجود نہ ہونا تعجب انگیز ہے"۔

خواجہ صاحب کے فلسفۂ عشق پر علیحدہ مضمون میں بحث کی جائے گی یہاں اس وقت یہ بتانا مقصود ہے کہ مذکورہ بالا مقولے میں جس جذبہ کو شعر کی بنیاد قرار دیا گیا ہے وہ خواجہ صاحب کے ہاں کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا

یہ ایک مسلمہ امر ہے کہ اگر جبلی طور پر کوئی کج فہم نہ ہو تو تعلیم انسان کو متوازن الفکر اور حقیقت پسند بنا دیتی ہے۔ یہ کلیہ شاعری پر بھی ہو بہو صادق آتا ہے وہ لوگ جو شعر محض وہبی طاقت کے بل بوتے پر کہتے ہیں ان کے ہاں کتنی ہی بے ساختگی اور کیف کیوں نہ ہو۔ ان کے اکثر اشعار فکری عناصر سے محروم ہوتے ہیں اور ایک فعال و سرگرم کار معاشرہ ان سے کوئی استفادہ نہیں کر سکتا۔

خواجہ غلام فرید ایک جیّد عالم تھے۔ ان کی نگاہ دقیقہ رس اور دماغ نکتہ آفریں تھا۔ یہی وجہ ہے کہ جب وہ دل کی بات زبان پر لاتے تو یہ تمام قوتیں ان کی رہنمائی کرتیں اور اس کے نتیجے میں جو شعر صفحۂ قرطاس پر آتے ان کی حیثیت اقوال زریں اور ارشادات عالیہ کی ہو جاتی تھی۔ آج بھی ان کا کلام پڑھنے والے جہاں اس کی پرسوز کیفیتوں سے محظوظ ہوتے ہیں۔ وہاں ان رموز و نکات سے بھی روشنی حاصل کرتے ہیں جو الفاظ کے

باریک پردوں سے صاف جھلکتے ہیں۔

اظہار خیالات کے لئے زبان وبیان کو بڑی اہمیت حاصل ہے بالخصوص شاعر تو وہی باکمال مانا جاتا ہے جس کے پاس الفاظ کا وافر ذخیرہ ہو۔ محاوروں پر قدرت تامہ رکھتا ہو اور طرز بیان میں جدت کا مالک ہو۔ خواجہ غلام فرید ان تمام خوبیوں سے متصف تھے۔ ان کے پاس نہ صرف ذخیرۂ الفاظ اور محاوروں کی بہتات تھی بلکہ وہ الفاظ کی تراش خراش کے ماہر۔ نئی نئی تراکیب کے موجد اور محاوروں کے صحیح استعمال میں ید طولیٰ رکھتے تھے۔ اس کے علاوہ ان کا طرز بیان اس قدر سادہ اور دلنشیں ہے کہ اس کا پڑھنے والا خواہ عالم فاضل ہو یا ان پڑھ دیہاتی سب مساوی طور پر اس سے متاثر ہوتے ہیں۔

موسیقی اور شاعری کا آپس میں چولی دامن کا ساتھ ہے۔ لیکن ایسا بہت کم ہوتا ہے۔ کہ شاعر فن موسیقی سے بھی واقف ہو۔ اگر حسن اتفاق سے یہ دو فن ایک جگہ جمع ہو جائیں تو سونے پر سہاگہ کا کام دیتے ہیں۔ خواجہ غلام فرید خود موسیقار تو نہ تھے لیکن فن موسیقی کو ایک ماہر فن کی طرح سمجھتے تھے۔ ان کے کلام میں کافی کی متعینہ بحروں کی مناسبت سے الفاظ کا اتنا حسین انتخاب ملتا ہے کہ باید وشاید۔ موسیقار خواجہ صاحب کی کافیوں کو اپنے فن کے عین موافق خیال کرتے ہیں۔ مغربی پاکستان کے گویوں میں شاید ہی کوئی ایسا گویا ہو جسے خواجہ صاحب کی کافیاں یاد نہ ہوں۔ قوالوں اور گویوں کے علاوہ شوقیہ گانے والے بھی انہیں خاص طرز میں گاتے ہیں۔ اور ان کی نغمگی سے کیفیاب ہوتے ہیں۔

خواجہ صاحب کے کلام کی ایک اور خوبی تسلسل خیال ہے جو ان کی اکثر کافیوں میں پایا جاتا ہے۔ جس طرح غزل مسلسل کسی ایک خیال کی از اول تا آخر ترجمانی کرتی ہے۔ اسی طرح خواجہ صاحب کی کافیاں مختلف الخیال اشعار کا مجموعہ ہونے کی بجائے ایک ہی خیال کی مکمل تفسیر ہوتی ہیں۔ اردو غزل میں وحدتِ فکر کا یہ رواج بہت پرانا نہیں۔ لیکن خواجہ صاحب نے اس کا آغاز اپنی کافیوں میں اس سے بہت پہلے کر دیا تھا۔ خود ملتانی کافیوں میں خواجہ صاحب سے پہلے اس تسلسل کی مثال نہیں ملتی۔ انہوں نے خود ہی اس کا آغاز کیا اور خود ہی اسے "معراجِ کمال" تک پہنچایا۔ گویا خواجہ صاحب "مسلسل کافی" کے مخترع ہی نہیں ماہر بھی تھے۔

ان تمام خوبیوں کے بعد خواجہ صاحب کے کلام کی وہ خوبی آتی ہے۔ جسے مقامی رنگ سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ شاعر جتنا بلند اور رفیع المرتبت ہوتا ہے اتنا ہی اُسے اپنی قومی و ملکی خصوصیات کا احساس رہتا ہے۔ وہ نہ صرف اپنی زبان کو اظہارِ خیالات کا ذریعہ بنا کر اپنے ہموطنوں کے لئے سامان راحت پیدا کرتا ہے بلکہ اپنی وطنی روایات اور قومی خصائص پر اپنی شاعری کی بنیاد رکھتا ہے۔ اسی قول کے مطابق خواجہ صاحب نے جن کی عظمت و سربلندی، مسلمات میں سے ہے شاعری کے لئے اپنی وطنی زبان کو منتخب کیا اور اس زبان کے بولنے والوں کے حالات و کوائف کو ہی پیش نظر رکھ کر اپنی شاعری کی داغ بیل ڈالی۔ ان کے کلام میں ریگستانی زندگی کے مناظر اور ہیر رانجھا۔ سسّی پنوں اور سوہنی مہینوال جیسے دیہاتی کردار جگہ جگہ نظر آتے ہیں۔ وہ فلسفے

کے باریک سے باریک مسئلے کو بھی عوام کی زبان اور عوام کے مناسب حال تشبیہات و استعارات میں بیان کرتے ہیں۔

چونکہ خواجہ صاحب وحدت الوجود اور ہمہ اوست کے جس فلسفے سے متاثر تھے۔ وہ ویدانت کی تعلیم سے کافی ملتا جلتا تھا اس لئے ان کی کافیوں میں کہیں کہیں برج بھاشا کا حسین پیوند بھی نظر آتا ہے۔ اسی اثر کے تابع انہوں نے بعض کافیوں میں سری کرشن کو معشوق اور گوپیوں کو عاشق قرار دیا ہے اور ان کی زبان سے واردات عشق کو بڑے پُر درد انداز میں بیان کیا ہے ملتانی اور برج کی اس آمیزش نے خواجہ صاحب کے کلام کو مسلمانوں کے علاوہ ہندوؤں میں بھی بہت مقبولیت بخشی۔ وہ اپنی کافیوں کے لئے ایسے عمدہ الفاظ کا انتخاب کرتے ہیں کہ پڑھنے والا اس کی گوناگوں کیفیات سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ بعض اوقات وہ لفظوں کی بناوٹ میں بھی اس طرح تصرف کرتے ہیں کہ اس سے اثر انگیزی دوبالا ہو جاتی ہے۔ مثلاً وہ دل کو مصغر کر کے "دلڑی" کا لفظ استعمال کرتے ہیں۔ علاوہ ازیں ان کے ہاں عروض کی پابندیوں سے زیادہ موسیقی کے اصولوں کا عمل دخل ہے۔

فی الحقیقت خواجہ صاحب ملتانی زبان کے شعراء میں ایک مجتہد کا درجہ رکھتے ہیں۔

جب تک ملتانی زبان موجود ہے ان کی کافیاں روح کو تڑپاتی اور دلوں کو گرماتی رہیں گی۔

خواجہ صاحب پر دوسرے شعراء کا اثر

اول اول ہر اہل کمال اپنے پیشروؤں کے نقوش پا کو مشعلِ ہدایت بناتا ہے. لیکن جوں جوں اس کی اپنی صلاحیتیں بروئے کار آنے لگتی ہیں وہ پرانی راہوں کو چھوڑ کر اپنے لئے نیا راستہ بناتا جاتا ہے. یہی راستہ پھر دوسرے آنے والوں کی راہنمائی کرتا ہے اور اس طرح چراغ سے چراغ جلنے کی روایت مسلسل قائم رہتی ہے.

خواجہ غلام فریدؒ نے جب میدانِ سخن میں قدم رکھا تو ان کے سامنے اپنی زبان کے شعراء کا اندوختۂ سخن بھی تھا اور دوسری زبانوں کے سرمایۂ شاعری کے نمونے بھی تھے. ملتانی شعراء میں بابا فرید رحمۃ اللہ علیہ کے علاوہ علی حیدر ملتانی. حافظ جمال خواجہ حسن گیلانی. عبدالحکیم اوچی اور مولوی لطف علی کا کلام زبان زد تھا. سندھ پر شاہ عبداللطیف بھٹائی اور سچل سرمست کی شاعری کا اعجاز چھایا ہوا تھا پنجاب میں شاہ حسین اور بلھے شاہ کے الاپے ہوئے نغمے گونج رہے تھے سرحد خوشحال خاں خٹک کے جگائے ہوئے جادو سے مسحور تھا اور جن علاقوں میں اردو بولی جاتی تھی وہاں نظیر اکبر آبادی. میر تقی میر. خواجہ میر درد. حکیم مومن خان. مرزا غالب اور استاد ذوق جیسے باکمال شعراء کے رنگ برنگ اور

جیتے جاگتے نقوش لوگوں کو دیوانہ بنائے ہوئے تھے۔

خواجہ غلام فریدؒ اگر سطحی قسم کے شاعر ہوتے تو وہ ان میں سے کسی کا بھی رنگ اختیار کر سکتے تھے لیکن چونکہ وہ غیر معمولی ذہن و فہم کے مالک تھے اس لئے انہوں نے ان سب سے استفادہ تو کیا لیکن کسی کے رنگ میں نہیں رنگے گئے۔ ابتداً ملتانی زبان کے شعراء میں مولوی لطف علی کا کلام اور سندھی میں شاہ عبداللطیف بھٹائی اور سچل سرمست کا کلام انہیں بہت مرغوب تھا بعض سندھی روایات کے مطابق شاہ بھٹائی کا کلام ہی خواجہ صاحب کی شعرگوئی کی تحریک کا باعث ہوا اور انہوں نے اس اثر کے تحت سندھی زبان میں اشعار کہنے شروع کئے۔ چنانچہ میر حسان الحیدری سہروردی "تذکرہ لطفی" کے حوالے سے لکھتے ہیں۔

"یہ بات پایۂ تحقیق کو پہنچ چکی ہے کہ عین عالم شباب میں خواجہ فریدؒ شاہ بھٹائی کا رسالہ اپنے مطالعہ میں رکھتے تھے اس مطالعہ نے خواجہ فرید کے دل میں نئی امنگیں اور نئے جذبات بھی پیدا کئے۔ محبت کے خوابیدہ جذبات کے بیدار ہوتے ہی ان کے دل میں شعرگوئی کے لئے ایک جوش اور ولولہ پیدا ہوا۔ ان کے ابتدائی کلام کا اکثر حصہ سندھی زبان میں تھا جو مرور ایام سے تمام تر ضائع ہو گیا اس کے باوجود فرید کا جو تھوڑا بہت سندھی کلام ملتا ہے اس سے شاہ لطیف کا رنگ ظاہر ہے"

(ماہِ نو۔ کراچی۔ جولائی ۱۹۶۲ء)

شاہ بھٹائی کے علاوہ سندھ کے سچل سرمست کا رنگ بھی خواجہ صاحب

نے ضرور قبول کیا ہو گا۔ کیونکہ "منصوری روش" کی تبلیغ میں وہ خواجہ صاحب کے پیشرو تھے۔ میر حسان الحیدری اس اتباع کو سچل سرمست سے خواجہ صاحب کے نسبی تعلق اور وطنی قربت کی دلیل قرار دیتے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ چونکہ خواجہ صاحب کا وطن سندھ سے بہت متصل ہے اس لئے خواجہ صاحب کے کانوں تک سچل سرمست کا کلام ضرور پہنچا ہو گا۔ بہاولپوری روایت کی رو سے مولوی لطف علی کی مثنوی سیف الملوک جو اس زمانہ میں بجد مقبول تھی خواجہ صاحب کی شعری صلاحیتوں پر جلا کرنے کا سبب بنی۔ چنانچہ اس روایت کی تصدیق خواجہ صاحب کے اپنے بیان سے بھی ہوتی ہے۔ دیوان فرید کے مقدمہ میں مقابیس المجالس کا یہ حوالہ درج ہے۔

"بعدازاں حضور خواجہ ابقاہ اللہ تعالی بقائہٗ فرمودہ اندکہ درابتدای سودا طالبان ایں راہ را مانند کلام سیفل کہ تصنیف لطف علی شاعر است دیگر ہیچ کلام پر ذوق در نظر نے آید پس من درابتدا حال یک یک جزو از سیفل درود گفتہ یاد میکردم"

"سیفل" مثنوی سیف الملوک کا مخفف ہے۔ یہ مثنوی نہ صرف اثرانگیزی، جذبات نگاری اور انداز بیان کے اعتبار سے بلند پایہ ہے۔ بلکہ محاورہ بندی، صحت لفظی اور ادائیگی مطالب کے لحاظ سے ملتانی زبان میں سند کا درجہ رکھتی ہے۔ خواجہ صاحب کا اپنی نو مشقی کے زمانہ میں اسے حفظ کرنا اس کی مزید عظمت کی دلیل ہے۔ لیکن یہ بات مذکورہ بالا روایت سے قطعی واضح ہو جاتی ہے کہ لطف علی کی سیف الملوک کے علاوہ کسی اور کا کلام اُن کی

نظر میں نہیں جچتا تھا۔ ظاہر ہے جب ان کا ذوق مزید بلند ہوا ہو گا تو سیف الملوک کی اثر انگیزی بھی زائل ہو گئی ہو گی۔ چنانچہ یہ واقعہ ہے کہ کلی طور پر وہ نہ شاہ بھٹائی یا سچل سرمست سے متاثر معلوم ہوتے ہیں اور نہ لطف علی کا رنگ ان پر غالب نظر آتا ہے۔ جزوی طور پر یقیناً ان کی شاعری میں تمام متقدمین خواہ وہ ملتانی ہوں یا سندھی۔ پنجابی ہوں یا اہلِ اردو سب کا کچھ نہ کچھ اثر پایا جاتا ہے۔ مثال کے طور پر ان کے کلام میں علم و حکمت کے جو چمکدار موتی دکھائی دیتے ہیں وہ بابا فرید کے تصرفات کا نتیجہ ہیں۔ عرفان و آگہی کے جو مقامات ملتے ہیں انہیں سندھ کے شاہ لطیف اور سچل سرمست نے استوار کیا جذب اور مستی کا رنگ' پنجاب کے شاہ حسین اور وارث شاہ سے روحانی طور پر حاصل ہوا۔ سلاست زبان۔ محاورہ بندی اور منظر کشی کی جو لطافتیں ان کے حصہ میں آئی ہیں اس میں لطف علی کی سیف الملوک کا ہاتھ ہے۔

اردو شعراء کی بعض خوبیاں بھی ان کے کلام میں دکھائی دیتی ہیں۔ مثلاً منظر نگاری کا جو کمال نظیر اکبر آبادی کی شاعری میں ملتا ہے۔ اس کی جھلک خواجہ صاحب کے ہاں بھی نظر آتی ہے۔ جس طرح نظیر اکبر آبادی منظر کے تمام اجزا و عناصر کو شعروں کا جامہ پہنا دیتا ہے۔ اسی طرح خواجہ صاحب جب کسی منظر کو منظوم کرتے ہیں۔ تو اس کے جملہ متعلقات کا بیان بھی شرح و بسط کے ساتھ کرتے ہیں۔ خاص طور پہ خواجہ صاحب کی کافیوں میں برکھا رت کا حال پڑھ کر نظیر اکبر آبادی کی مشہور نظم "کیا کیا مچی ہیں یارو برسات کی بہاریں" یاد آ جاتی ہے۔ اس نظم کے چند بند ملاحظہ ہوں۔

ہیں اس ہوا میں کیا کیا برسات کی بہاریں۔ سبزوں کی لہلہاہٹ باغات کی بہاریں
بوندوں کی جھمجھاہٹ قطرات کی بہاریں۔ ہر بات کے تماشے ہر گھات کی بہاریں

کیا کیا مچی ہیں یارو برسات کی بہاریں

بادل ہوا کے اوپر ہو مست چھا رہے ہیں۔ جھڑیوں کی مستیوں سے دھومیں مچا رہے ہیں
پڑتے ہیں پانی ہر جا جل تھل بنا رہے ہیں۔ گلزار بھیگتے ہیں سبزے نہا رہے ہیں

کیا کیا مچی ہیں یارو برسات کی بہاریں

جو خوش ہیں وہ خوشی میں کاٹے ہیں رات ساری۔ جو غم میں ہیں انہوں پر گذرے ہے رات بھاری
سینوں سے لگ رہی ہیں جو ہیں پیا کی پیاری۔ چھاتی پھٹے ہے انکی جو ہیں برہ کی ماری

کیا کیا مچی ہیں یارو برسات کی بہاریں

اب بے ہنوں کے اوپر ہے سخت بیقراری۔ ہر بوند مارتی ہے سینے اوپر کٹاری
بدلی کی دیکھ صورت کہتی ہیں یاری یاری۔ بے ہے نہ لی پیا نے انکی بھی سدھ ہماری

کیا کیا مچی ہیں یارو برسات کی بہاریں

اب خواجہ صاحب کی کافی کے یہ بند دیکھیے۔

آئے مست ڈہاڑے ساون دے

وہ ساون دے من بھاون دے

بدلے پورب ماڑ ڈکھن دے | کھلے بھورے سوسو ونڑ دے
چارے طرفوں زور پون دے | سارے جوڑ وساون دے

ڈیہاں پینگھاں ساویاں بیلیاں | راتیں کھمنیاں گھمنڑ رنگیلیاں

گج گج گاجاں گجن رسیلیاں وقت سنگار سہاون دے

روہی راوے تھیاں گلزاراں تھل چیتر انگ دی باغ بہاراں
گھنڈڑ تواراں بارش باراں چھپے دھانوڑ گانوڑ دے

چاندنی رات ملہاڑی ڈینھہ ہے ٹھنڈڑیاں ہیلاں رم جھم مینہ ہے
سوہنی موسم نگڑا نیمہ ہے گئے ویہلے غم کھاون دے

ان میں برکھارت کی وہ تمام تفصیلات موجود ہیں جو نظیر اکبرآبادی کے ہاں ملتی ہیں۔ لیکن اس یکسانیت کے باوجود دونوں میں ایک نمایاں فرق بھی ہے۔ نظیر اکبرآبادی کی حیثیت ایک تماشائی کی ہے۔ وہ جو کچھ دیکھتے ہیں اسے من وعن شعر کے قالب میں ڈھال دیتے ہیں۔ اس کے برعکس خواجہ صاحب اپنے منظر کے خود کردار معلوم ہوتے ہیں۔ ان کے اشعار میں مشاہدات سے زیادہ احساسات و جذبات کی کارفرمائی ہے۔ اس کے علاوہ رجائیت جو ان کا خاص جوہر ہے ان شعروں سے بھی صاف عیاں ہے۔ وہ پرکیف موسم کا ذکر کر کے اپنے زخموں کو ہرا نہیں کرتے۔ بلکہ دل کو یہ تسلی دیتے ہیں کہ ابتک غم والم کا جو دور دورہ تھا وہ فصل بہاری کے صدقے میں ختم ہو جائے گا۔ اور ہر طرف خوشی ہی خوشی کا تسلط ہوگا۔

نظیری اکبرآبادی کی ایک اور معرکتہ آلارا نظم جس کا مصرعہ ہے۔

سب ٹھاٹ پڑا رہ جائیگا جب لاد چلے گا بنجارا

خواجہ صاحب کی اس کافی سے بہت مشابہ ہے۔

جیون ڈینہہ اڈھائی وو یار ستّ گھت فخر وڈائی وو یار

جس طرح خواجہ غلام فرید نے اس کافی میں ناپائیداریٔ عالم اور دُنیا وی تعلقات کی نااستواری کا نقشہ کھینچا ہے۔ اسی طرح نظیر اکبر آبادی کی نظم میں بھی دنیا کی بے ثباتی کا ہمہ جہتی اور بڑا پُر تاثیر جائزہ ملتا ہے۔ نظیر اکبر آبادی کی نظم کے بعض بند یہ ہیں۔

ٹک حرص و ہوا کو چھوڑ میاں مت دیس بدیس پھرے مارا
قزاق اجل کا لوٹے ہے دن رات بجا کر نقّارا
کیا بدھیا بھینسا بیل شتر کیا گونیں پلا سر بھارا
کیا گیہوں چاول موٹھ مٹر کیا آگ دھواں اور انگارا
سب ٹھاٹ پڑا رہ جائے گا جب لاد چلے گا بنجارا

تو بدھیا لادے بیل بھرے جو پورب پچھم جاوے گا
یا سود بڑھا کر لاوے گا یا ٹوٹا گھاٹا پاوے گا
قزاق اجل کا رستے میں جب بھالا مار گراوے گا
دھن دولت نانی پوتا کیا اک کنبہ کام نہ آوے گا
سب ٹھاٹ پڑا رہ جائے گا جب لاد چلے گا بنجارا

جب چلتے چلتے رستے میں یہ گون تری ڈھل جائے گی
اک بدھیا تیری مٹی پر پھر گھاس نہ چرنے آئے گی

یہ کھیپ جو تو نے لادی ہے سب حصوں میں بٹ جائے گی
دھی پوت جنوائی بیٹا کیا بنجارن پاس نہ آئے گی

سب ٹھاٹھ پڑا رہ جائے گا جب لاد چلے گا بنجارا

یہ نظم از اول تا آخر بڑے تاثر کی حامل ہے۔ اسے پڑھنے کے بعد دُنیا سے سخت نفرت ہوتی ہے۔

اب خواجہ صاحب کی کافی کے بھی کچھ بند ملاحظہ ہوں۔

کتھ اد پنگیھ ہیں ملکانے   ناز حسن کتھ راج بہانے
کتھ ماں بہنیں بھائی وو یار

کتھ رانجھن کتھ کھیڑے بھیڑے   کتھ رہ گئے اوہ جھگڑے جھیڑے
کتھ چوچک دی جائی وو یار

ماہی منجھیاں ہیر سلیہٹی   عطروں بھنڑی مُشک لپیٹی
گئے سب جھوک لڈائی وو یار

یہ کافی دنیائے فانی کا مظہر ہونے کے باوجود یاس و قنوط کی محرک نہیں بلکہ اس کے چند بند پڑھنے کے بعد ہی یہ اندازہ ہوتا ہے کہ خواجہ صاحب لوگوں کو دُنیا سے بیزار نہیں کرنا چاہتے بلکہ تصویر کا تاریک رُخ دکھا کر انہیں روشن رُخ کی طرف متوجہ کرتے ہیں اور بتاتے ہیں کہ انسان کو مایوس نہیں ہونا چاہیئے چنانچہ کہتے ہیں۔

مچھلیں پینگیں لاسوں تاریں   چنکیں گھنڈڑیں ہونگ تواریں
ہجوں راند رسائی وو یار

تھیاں سرسبز فرید دیاں جھوکاں   تھروں سبز تھیاں ول سوکھال
بختیں واگ ولائی دو یار

ان اشعار میں خواجہ صاحب اپنے محبوب سے مخاطب ہو کر کہتے ہیں کہ دیکھ آسمان پر رنگ برنگ کے بادلوں نے کیسا دلفریب سماں پیدا کر دیا ہے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اب ہماری قسمت کے دن پلٹنے والے ہیں۔

خواجہ صاحب کی اس رجائیت نے یہاں بھی انہیں نظیر اکبر آبادی سے ایک علیحدہ مقام دے دیا ہے۔ فی الحقیقت خواجہ صاحب میں بیک وقت اتنی خوبیاں جمع ہو گئی ہیں کہ ایک نظر دیکھنے کے بعد تو انہیں ان کے کسی بھی پیشرو سے مشابہ کیا جا سکتا ہے لیکن جب مجموعی طور پر ان کے جملہ محاسن سامنے آتے ہیں تو ان کی شخصیت سب سے جدا اور انفرادی حیثیت کی حامل بن جاتی ہے۔

تصوف اور خواجہ غلام فرید

انسان کے دل پر جو کیفیات مرتب ہوتی ہیں اور پھر ان سے ایک خاص قسم کا ذوق و وجدان پیدا ہوتا ہے اسے تصوف سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ اس خیال کی ابتدا کب سے ہوئی اور اس کا ماخذ کیا ہے۔ یہ علیحدہ موضوعات ہیں، یہاں ہم اختصار کے ساتھ تصوف کی اساسی قدروں اور اس کے تاریخی ارتقا کا ذکر کریں گے تاکہ اس علم کی ماہیت کا اندازہ لگانے کے ساتھ ساتھ یہ بھی پتہ چل سکے کہ اگلے صفحات میں ہم جس صوفی شاعر کے کلام پر قلم اٹھانے والے ہیں ان کی شاعری کے فکری عناصر کیا تھے۔

تیسری صدی ہجری کے جید صوفی ذوالنون مصری کہتے ہیں "صوفی وہ لوگ ہیں جنہوں نے سب کچھ چھوڑ کر خدا کو لیا ہے۔" حضرت معروف کرخی تصوف کو حصول حقائق اور خلائق کے مال و متاع سے یاس کا نام قرار دیتے ہیں اور ابوالحسن نوری کے نزدیک تصوف تمام نفسانی لذتوں کے ترک کر دینے کا نام ہے۔

ان سب مقولوں میں جو روح کارفرما ہے وہ حقیقتِ مطلقہ کی تلاش ہے اس غرض کے لیے ترک ماسوی اللہ۔ رجوع الی اللہ۔ قناعت و توکل۔ تسلیم و رضا

اور تزکیہ نفس جیسے اصول وضع کیے گئے ہیں۔ اصحاب صفہ اس سلسلہ کی پہلی کڑی قرار پاتے ہیں جنہوں نے اپنی توجہ زندگی کے باطنی پہلو پر مرکوز رکھی اور تزکیہ نفس۔ کثرتِ اطاعات اور زہد و خلوت نشینی کو اپنا معمول بنایا۔ اصحاب صفہ کے بعد حضرت حسن بصری کا نام گروہ صوفیا میں سرفہرست ہے ان کے متعلق مشہور ہے کہ ان پر خوف کی ایسی کیفیات طاری ہوتی تھیں کہ ان کو دیکھ کر یہ معلوم ہوتا تھا گویا تمام آتشِ جہنم انہیں کے لئے پیدا کی گئی ہے۔

دوسری صدی ہجری کے اواخر میں تصوف نے بے حد مقبولیت حاصل کی۔ مردوں میں ابراہیم بن ادھم اور عورتوں میں رابعہ العدویہ نے مسلک تصوف میں کافی نام پیدا کیا۔ تیسری صدی ہجری میں ذوالنون مصری۔ بایزید بسطامی اور حضرت جنید بغدادی جیسے جلیل القدر صوفی پیدا ہوئے۔ وجد و معرفت کے نظریئے اور خود فراموشی و فنا کی تعلیم اسی دور میں عام ہوئی۔ چوتھی صدی ہجری میں تصوف خیالوں اور دماغوں سے نکل کر صفحۂ قرطاس پر بھی نظر آنے لگا۔ اس دور میں صوفیانہ انداز کی کئی قابل قدر کتابیں لکھی گئیں۔ یہی وہ دور ہے جب نظریاتی اعتبار سے مختلف سلسلوں کی داغ بیل پڑی۔ یہ بنو عباس کے سیاسی انتشار کا زمانہ تھا مسلمان مذہبی اعتبار سے شکوک و شبہات میں مبتلا رہنے لگے تھے۔ ان حالات میں تصوف کو پھولنے پھلنے کا اور زیادہ بہتر موقع مل گیا اور اہلِ تصوف کھلے عام اپنے خیالات و جذبات کا اظہار کرنے لگے۔ ابوبکر شبلی پہلے شخص ہیں جنہوں نے سرِ منبر تصوف کی تعلیمات کا آغاز کیا۔ مقتدر کے عہد میں حسین بن منصور نے وحدت وجود کا نغمہ جس لے میں شروع کیا وہ بعض علماء کے نزدیک خلاف شرع تھا اس لئے

اس جرم کی پاداش میں انہیں سولی پر چڑھا دیا گیا۔

چھٹی صدی ہجری میں شیخ محی الدین ابن عربی نے وحدت الوجود کے مسئلہ کو فلسفیانہ اور استدلالی رنگ دیا۔ ان کے نظریے کے مطابق موجود محض حق سبحانہٗ تعالیٰ کی ذات ہے۔ باقی سب اضافتیں اور نسبتیں ہیں جن کا حقیقت میں کوئی وجود نہیں ہے۔ یہ نظریہ تمام عالم اسلام میں مقبول ہوا اور مسلک وجودی کے نام سے اسے تمام صوفیا نے اپنایا۔ حضرت مجدد الف ثانی پہلے بزرگ ہیں جنہوں نے اس کی تردید میں ایک دوسرا نظریہ "وحدت شہود" پیش کیا۔ ان کے فلسفہ کی رُو سے توحید شہودی عین الیقین ہے اور توحید وجودی علم الیقین ہے اور چونکہ عین الیقین کا درجہ علم الیقین سے بلند ہے اس لئے توحید شہودی، وحدت وجود سے ارفع ہے۔ چنانچہ وہ فرماتے ہیں۔

"توحید شہودی یکے دیدنست یعنی مشہود سالک جز یکے نہ باشد و توحید وجودی یک موجود دانستن است وغیر او را معدوم انگاشتن پس توحید وجودی از قبیل علم الیقین آمد و شہودی از قسم عین الیقین، توحید شہودی از ضروریات ایں راہ است چہ فنا بے ایں توحید متحقق نمی شود و عین الیقین بے آں میسر نمی شود۔ زیرا کہ رویت یکے باستیلائے او مستلزم رویۃ ماسوائی اوست، بخلاف توحید وجودی کہ نہ چنیں است یعنی ضروری نیست وچہ علم الیقین بے آں معرفت حاصل۔ چہ علم الیقین مستلزم نفی ماسوائی او نیست"

اس نظریاتی اختلاف کے باوجود شیخ محی الدین ابن عربی کا فلسفۂ وحدت وجود

تصوف کا مرکزی نقطہ مانا جاتا ہے اسی کو ہمہ اوستی مسلک سے بھی تعبیر کرتے ہیں۔ جس میں وجود کا اطلاق محض وحدتِ حقہ پر ہوتا ہے۔ باقی ممکنات بہ اعتبار وجود معدوم و موہوم ہیں۔ لیکن مظاہر مرتبہ کے اعتبار سے ان کی بھی ہستی ہے اور انہیں نسبتوں کے اعتبار سے وہ مامور۔ مکلّف اور محل ثواب و عذاب ہے۔ اس لئے حقیقتِ انسانیہ عین ہے حقیقت الٰہیہ کی۔ لیکن ہیکل بشریت یعنی شکل و صورت کی مثال عرض کی سی ہے۔ اور وجود اپنی ذات کی حقیقت میں نہ جوہر ہے نہ عرض۔ بایں ہمہ جو موجودات خارجی ہیں وہ عین ہیں موجودِ حقیقی کے۔ اس اعتبار سے نہیں کہ ان کی ہستی جداگانہ ہے بلکہ اس اعتبار سے کہ ہستی محض احدیت مطلقہ کی ہے۔ چنانچہ جب صوفی وحدت الوجود کہتے ہیں تو ان کی مراد حقیقت وجود سے ہوتی ہے نہ کہ اضافات امکانیہ اور صور وہمیہ سے۔ انا الحق کی بات بھی انائے مجازی کے لئے نہیں ہے بلکہ انائے حقیقی کے لئے ہے۔ صوفی کہتے ہیں کہ جو موجود ہے اس کے لئے فنا نہیں ہے اور جس کے لئے فنا ہے وہ موجود ہی نہیں۔ بہ الفاظ دیگر وجود کا اطلاق اس پر بر سبیل مجاز ہوتا ہے۔

اس فلسفے کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ صوفی جو کچھ عالم شہادت میں دیکھتا ہے اسے موہوم سمجھتا ہے اور اس کو ہر ممکن اور ہر خارجی ظاہر میں ذاتِ حق جو موجودِ حقیقی ہے جلوہ آرا نظر آتی ہے لہٰذا وہ ہمہ اوست کا نعرہ لگاتے ہیں اور ذرہ ذرہ میں ذات الٰہی کی تجلی محسوس کرتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ سوائے اللہ کے کوئی چیز موجود نہیں ہے۔ لیکن اس سے یہ نہیں سمجھنا چاہیئے

کہ وہ حقیقت کے اس عکس اور ظل کو جو عدم کے آئینہ پر پڑ رہا ہے خدا سمجھتے ہیں یا کسی انسان کو خدا تصور کرتے ہیں یا یہ سمجھتے ہیں کہ اشیاء اپنی اضافی اور اعتباری حیثیت سے خدا ہیں۔

خواجہ غلام فرید جو اسی مسلک کے پیرو اور سرگرم مبلّغ تھے اس کی تشریح ان الفاظ میں کرتے ہیں۔

"اللہ تعالیٰ ایک ہستی مطلق اور وجود محض کا نام ہے جس کا انحصار اور تشکل کچھ بھی نہیں اور وہ ہستی مطلق جملہ موجودات میں ساری ہے پس جمیع موجودات بحیثیت وجود عین باری ہیں اور بحیثیت تعیّن غیر باری۔ پس غیریت اعتباری ہے اور در اصل ہمہ اوست

(مقدمہ دیوان فرید)

خواجہ صاحب کا تمام کلام اسی مسلک کا آئینہ دار ہے۔ وہ شیخ محی الدین ابن عربی کو اس سلسلہ میں اپنا امام مانتے ہیں اور ان کٹ ملاؤں کو جو مذہب کا نام لے کر صوفیوں کو وحدتِ وجود کے مسلک سے باز رہنے کی تلقین کرتے ہیں بڑی کھری سناتے ہیں۔ ان کی ایک کافی کے یہ شعر اسی حقیقت کی نشاندہی کرتے ہیں۔

ملاں نہیں کہیں کار دے   شیوے نہ جانن یار دے

سمجھن نہ بھیت اسرار دے   وچ گنڈ دے بھرے تھئے دنی

یعنی ملّا کسی کام کے نہیں۔ ان کو تو صرف لوگوں پر اعتراض کرنا اور مذاق اُڑانا آتا ہے۔ ورنہ وہ تو محبوب ازلی کے انداز و ناز سے ناواقف ہیں اور اسرار الٰہی کے مخفی رموز کو سمجھ بھی نہیں سکتے یہی وہ لوگ ہیں جو اپنی کج فہمی کی وجہ سے پشت

کے بل جا گرتے ہیں۔

ملاؤں سے بیزاری اور ابن العربی سے خواجہ صاحب کی عقیدت کا حال اس

بند سے بھی ظاہر ہے۔

ملوانے دے وعظ نہ بھانے بیشک ساڈا دین ایمانے
ابن العربی دی دستور

ترجمہ:۔ ظاہر ہیں مولوی صاحبان کے پند و نصائح ہمیں پسند نہیں۔ ہم تو حضرت ابن العربی

کے دستور اور طریقے کے پیرو ہیں اور انہیں کا مسلک ہمارا دین اور ایمان ہے

اسی کافی میں حضرت بایزید بسطامی اور حسین بن منصور حلاج سے

خواجہ صاحب کی عقیدت کیشی ملاحظہ ہو۔

عاشق مست مدام ملامی کہہ سبحانی بن بسطامی
آکھ انا الحق، تھی منصور

ترجمہ:۔ عاشق تو ہمیشہ تیر ملامت کے ہدف رہا کرتے ہیں۔ حضرت بایزید بسطامی

کی طرح سبحانی کا کلمہ کہکر مقام بسطامی کی سیر کر اور انا الحق کہکر منصور کا درجہ

حاصل کر۔

جب تک وحدت الوجود کے عقیدے میں فلسفیانہ اور استدلالی رنگ

پیدا نہیں ہوا تھا۔ اکثر صوفیا اپنے خاص ذوق و وجدان کے تابع ایسے نعرے

بلند کر دیتے تھے جن سے اس عقیدے کی غمازی ہوتی تھی۔ چنانچہ حضرت

بایزید بسطامی نے فرمایا۔

"سبحانی سبحانی ما اعظم شانی"

یعنی میں پاک ہوں میری شان کتنی بلند ہے

اسی طرح حسین بن منصور حلاج پر وحدت کا نشہ طاری ہوا اور ان کی زبان سے نکلا " انا الحق " (یعنی میں حق ہوں) ان نعروں کو کفر سے تعبیر کیا گیا اور اس جرم کی پاداش میں منصور کو تختۂ دار پر کھینچ دیا گیا۔ صوفیائے کرام بزرگوں کے ان اقوال کو حقیقت پر مبنی خیال کرتے ہیں چنانچہ منصور کے نعرۂ اناالحق کے متعلق ان کی یہ تاویل ہے کہ اس کے معنی یہ نہیں کہ میں حق ہوں بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ میں نہیں ہوں اور وجود حق ہی کا ہے۔

خواجہ صاحب نے مذکورہ بالا بندمیں بسطامی اور منصور کے انہیں نعروں کو ذوق و وجدان کا شاہکار قرار دے کر ان کی پیروی کی دعوت دی ہے وہ فلسفۂ وحدتِ وجود کو ہر شک و شبہ سے مبرّا خیال کرتے تھے اور اس بات پر زور دیتے تھے کہ یہ مسئلہ علمی موشگافیوں کے بجائے صحیح ذوق کا طالب ہے۔ جن لوگوں کو یہ ذوق نصیب ہو جاتا ہے ان کے پیش نظر محبوب حقیقی کے سوا کوئی چیز نہیں رہتی اور وہ اسی کی محبت میں مست و بیخود ہو جاتے ہیں۔ چنانچہ ارشاد ہوتا ہے۔

صاف مبرّا غیر خیالوں پاک عیالوں، آلوں، مالوں
راسخ وجدوں ذوقوں حالوں دہ وہ مستیندی مستی

ترجمہ:۔ صاف باطن اور ماسویٰ اللہ کے خیال سے بیزار اور آزاد سالک جو اپنے اہل وعیال۔ آل و مال سے بھی بے پروا ہوں۔ اور اپنے وجدان ذوق اور حال میں

اس قدر مستحکم اور مضبوط ہوں کہ سوائے محبوب حقیقی کے اور کوئی چیز ان کے لئے مرکز توجہ نہ ہو سکتی ہو وہ دراصل مست الست ہیں۔ سبحان اللہ ان کی مستی بھی بڑی بلند پایہ ہے۔

خواجہ صاحب علوم متداولہ کے ماہر تھے اور ان علوم کی افادیت کے بھی قائل تھے۔ لیکن ان کے نزدیک ان تمام علوم کا حاصل علم توحید تھا یعنی اگر کسی کو تمام علوم پر دسترس ہو اور وہ توحید کے علم سے بے بہرہ ہو تو اس کی علمیت محل نظر ہو گی۔ چنانچہ وہ کہتے ہیں۔

فقہ، اصول، کلام، معانی منطق، نحو تے صرف مبانی
ٹھپ رکھ ہے توحید غیور

ترجمہ:۔ راہِ حقیقت مروجہ علوم فقہ۔ اصول۔ کلام معانی۔ منطق۔ صرف و نحو وغیرہ پر منحصر نہیں ہے۔ انہیں اٹھا کر ایک طرف رکھ دے کیونکہ توحید بہت غیور ہے اور وہ کسی علم کی مداخلت برداشت نہیں کر سکتی۔

خواجہ صاحب نے خود بھی سلوک کی راہیں اسی فلسفہ وحدتِ وجود کے مرکزی تخیّل کے تابع طے کی تھیں اور وہ دوسرے سالکانِ راہ طریقت کو بھی اسی کا درس دیتے تھے ان کے درس کا انداز بڑا دلنشیں اور عام فہم تھا۔ صرف طبقہ علما ہی نہیں۔ ایک عام انسان بھی ان کے افکار و خیالات سے مستفیض ہو سکتا تھا۔ چند شعر ملاحظہ ہوں۔

سمجھ سنجانی غیر نہ جانی
سبھ صورت ہے عین ظہور

ترجمہ :۔ اے سالک! یہ سمجھ لے کہ دنیا کی ہر صورت میں خالق عالم کی قدرت کا جلوہ ہے اسی لئے کسی چیز کو اس کے حدود قدرت سے باہر نہ سمجھ

رکھ تصدیق نہ تھی آوارہ کعبہ، قبلہ، دیر، دوارہ
مسجد مندر ہکڑو نور

ترجمہ :۔ آوارہ و پریشان نہ ہو۔ اور یقین کرلے۔ قبلہ۔ دیر۔ دوارہ اور مسجد مندر میں ایک ہی نور کی تلاش کی جاتی ہے۔

حسن ازل تھیا فاش بیٖن ہر ہر گھاٹی وادیٔ ایمن
ہر ہر پتھر ہے کوہ طور

ترجمہ :۔ حسن ازل برملا اور ظاہر ہے۔ ہر ہر گھاٹی میں وادیٔ ایمن کا اور ہر ہر پتھر میں کوہ طور کا جلوہ نظر آتا ہے۔ یعنی دنیا کی کوئی چیز ایسی نہیں جس میں قدرت الٰہی کے آثار موجود نہ ہوں۔

تصوف کی اصطلاح میں وحدت ہی کثرت میں جلوہ گر ہوتی ہے۔ یعنی اگرچہ کائنات میں بے شمار چیزیں نظر آتی ہیں۔ لیکن حقیقت میں وہ ایک وحدتِ مطلقہ کا ہی منظر ہوتا ہے۔ جسے نگاہ حق شناس دیکھ سکتی ہے۔

خواجہ میر درد نے اسی فلسفے کی طرف ذیل کے شعر میں اشارہ کیا ہے

ماہیتوں کو روشن کرتا ہے نور تیرا
اعیان ہیں مظاہر، ظاہر ظہور تیرا

خواجہ صاحب نے اس خیال کو نت نئے انداز میں باندھا ہے چند

شعر ملاحظہ ہوں۔

بن دلبر شکل جہان آیا ہر صورت عین عیان آیا

کتھے ریت پریت دا ویس کرے کتھے عاشق تھی پردیس پھرے
کھلے گوچ مارو کیس دھرے لٹ دھاری تھی مستان آیا

جب عرفان وحدت حاصل ہو جاتا ہے۔ تو نگاہ شوق میں رسم و رواج اور محبت کے بھیس میں بھی یار کا جلوہ نظر آتا ہے۔ خواجہ صاحب کہتے ہیں کہ یہ جو عشاق کی شکل میں دیس بدیس مارے مارے پھرتے ہیں یہ بھی قدرت کے مظاہر ہیں۔ گویا

لو شمع حقیقت کی اپنی ہی جگہ پہ ہے
فانوس کی گردش میں کیا کیا نظر آتا ہے

خواجہ صاحب بادۂ وحدت کے نشے میں پوری طرح سرشار ہونے کے باوجود احکام الٰہی سے غافل نہ تھے۔ وہ اپنے مخاطبین کو جہاں وحدت کی شراب پلا کر مست و بیخود بناتے ہیں وہاں فرمانِ الٰہی کے ضروری نکات بھی ان کے کان میں ڈالتے جاتے ہیں۔ دیکھیے اسی کافی کے آخری بند میں کتنی پتے کی بات کہی ہے

خاموش فرید اسرار کنوں چپ بیہودہ گفتار کنوں
پر غافل نہ تھی یار کنوں ایہو لاریب فرمان آیا

ترجمہ:- اے فرید راز کی باتیں بیان نہ کر اور خاموش ہو جا۔ بیہودہ باتیں نہ بنا اور یار

(خدا) سے غافل نہ ہو کیونکہ خدا کا یہی فرمان ہے۔

صوفیائے کرام تصوف کو اسلامی تعلیمات کا نچوڑ سمجھتے ہیں اور اس سلسلہ میں اپنے تمام معتقدات اور مشاغل کا جواز کتاب و سنت سے پیش کرتے ہیں۔ مثال کے طور پر وحدت الوجود کا نظریہ قرآن مجید کی ان آیات سے ثابت کیا جاتا ہے۔ (۱) ھو الاول والاخر والظاھر والباطن

وہی اول ہے۔ وہی آخر ہے وہی ظاہر ہے وہی باطن ہے۔

(۲) فاینما تولوا فثم وجہ اللہ

تم جدھر بھی رُخ کرو اُدھر اللہ کا منہ ہے

(۳) اللہ نور السموات والارض

اللہ آسمانوں اور زمین کا نور ہے

(۴) ھو معکم این ما کنتم

خدا تمہارے ساتھ ہے تم جدھر بھی رخ کرو

(۵) نحن اقرب الیہ من حبل الورید

ہم انسان کی شہ رگ سے بھی زیادہ قریب ہیں

خواجہ غلام فرید کا توحیدی مسلک بھی انہی آیات قرآنی کا مرہونِ منت نظر آتا ہے۔ چنانچہ کہتے ہیں

نحن اقرب راز انوکھا وھو معکم ملیا ہوکا

سمجھ سونجا نوعالم لوکا ہے ہر روپ میں عین نظارا

ترجمہ:۔ نحن اقرب کا راز عجیب و غریب ہے اور وھو معکم کی منادی بھی ہو چکی ہے

اے دنیا کے لوگو اس بات کو اچھی طرح سمجھ اور پہچان لو کہ ہر صورت میں عین اسی کا جلوہ ہے

قرآن مجید کی ایک آیت ہے وفی انفسکم افلا تبصرون جس کے معنی

ہیں خدا کی قدرت و وجود کے دلائل تمہارے اپنے اندر موجود ہیں۔ کیا تم انہیں

دیکھ نہیں سکتے۔ اسی مفہوم کی مطابقت میں یہ حدیث بھی مشہور ہے لودلّی

جبل لعلی اللہ ھبط جس کا مطلب یہ ہے کہ اگر نیچے رسی لٹکائی جائے تو وہ اللہ پر

ہی جا پڑے گی۔ یعنی ذات الٰہی ہر جگہ، اوپر نیچے موجود ہے۔

مولانا جامی کہتے ہیں

جامی از چاہ طبیعت بدر آتا بینی سر لودلی جبل لعلی اللہ ھبط

خواجہ صاحب نے مذکورہ بالا آیت اور حدیث دونوں کو ان شعروں

میں بیان کیا ہے۔

وفی انفسکم سرِّ الٰہی لودلیتم فاش گواہی

ہر صورت وچ رانجھن ماہی کیتا ناز دا ڈھنگ نیارا

ترجمہ:۔ وفی انفسکم کا معاملہ ایک راز الٰہی ہے اور لودلی جبل لعلی اللہ ھبط

کی حدیث صاف گواہی دے رہی ہے کہ محبوب بالا و پست سے مستغنی ہر جگہ

اور ہر صورت میں جلوہ گر ہے اور اس کے ناز و ادا کے ڈھنگ عجیب ہیں۔

تصوف کے ایک نظریئے کے مطابق وحدت کی ایک مثال ایک دریا کی سی

ہے اور انسان ایک قطرے کے مانند ہے جس طرح قطرہ بیرونِ دریا کچھ نہیں

اسی طرح انسان جب تک وحدتِ حقہ میں گم نہ ہو اس کا اپنا وجود بے معنی

و بے حقیقت ہے۔ بہ الفاظ دیگر حیاتِ ابدی اسی وقت حاصل ہو سکتی ہے جب

انسان خود کو مٹا کر ذاتِ مطلق کا جزو بنا دے غالب نے اسی نکتے کو اس شعر میں بیان کیا ہے۔

عشرتِ قطرہ ہے دریا میں فنا ہو جانا
درد کا حد سے گذرنا ہے دوا ہو جانا

خواجہ صاحب بھی اس بحرِ حقیقت کے پورے شناور تھے چنانچہ کہتے ہیں۔

وصل فرید کوں حاصل ہویا جب ہو گیا نابود

یعنی فرید کو اس وقت وصالِ دوست ہوا جب وہ محبت کی راہ میں فنا ہو گیا۔
مطلب یہ ہے کہ قربِ خدا اس وقت تک ممکن نہیں جب تک انسان اپنے پندار کا لباس نہ اتار پھینکے۔

خاک شو پیش ازانکہ خاک شوی

تصوف میں تزکیہ نفس کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔ کیونکہ صوفیا کا خیال ہے کہ جستجوئے حق کی تکمیل اس وقت تک نہیں ہو سکتی جب تک نفس باقی ہے۔ جو لوگ موتوا قبل ان تموتوا کے مصداق مرنے سے پہلے مر جاتے ہیں ان کے لئے موت ہی زندگی بن جاتی ہے۔ آتش مرحوم نے اس فلسفے کی طرف اس شعر میں اشارہ کیا ہے۔

موئے جو پیشتر مرنے سے وہ لوگ
کفن سمجھے قبائے زندگانی

ترک تلذذات کی افادیت پر علامہ اقبال کا یہ شعر بھی بہت خوب ہے

زاہد کمال ترک سے ملتی ہے یاں مراد
دُنیا جو چھوڑ دی ہے تو عقبیٰ بھی چھوڑ دے

فنائے نفس کے اس موضوع پر خواجہ غلام فرید نے بڑی معرکتہ آلارا کافیاں کہی ہیں۔ ذیل میں چند شعر ملاحظہ ہوں۔ دیکھیئے دنیا دی آرام و آسائش سے کنارہ کش ہو کر خدا سے لو لگانے کا کتنا عمدہ درس دیا ہے۔

تھئی تابع خلقت سب تاں وی کیا تھئی پیا
ہئی گم تھیوں مطلب

ترجمہ:۔ اگر سب مخلوق تمہارے تابع ہو گئی تو کیا ہو گیا۔ اصل مطلب تو یہ تھا کہ تم خود گم ہو جاؤ۔ یعنی اپنے نفس امارہ کو مار کر ذات باری کی محبت میں گم ہو جاؤ۔

سارے جگ تے حکم چلانویں بادشاہی دا منصب
تاں وی کیا تھئی پیا

ترجمہ:۔ اگر شاہی کا مرتبہ حاصل کر کے تو نے ساری دُنیا پر حکمرانی کی تو بھی کیا ہوا

دُنیا دے وچ عزت پایو گیوں عقبیٰ نال طرب
تاں وی کیا تھی پیا

ترجمہ:۔ اگر دُنیا میں عزت پائی اور آخرت میں تم مسرت سے گئے یعنی عاقبت بخیر ہوئی تو پھر کیا ہو گیا۔

مدعا یہ ہے کہ دُنیا کی تمام کر و فر۔ شان و شوکت اور عیش و طرب بے معنی و بے کار ہیں۔ اصل مقصود حق کی تلاش ہونا چاہیئے۔ اگر ان تمام چیزوں کے بغیر بھی یہ مقصد حاصل ہو جائے تو بڑی بات ہے۔ خواجہ صاحب

صرف طلبِ حق کی اہمیت ہی نہیں بتاتے بلکہ یہ بھی واضح کرتے ہیں کہ اگر انسان اپنی حقیقت کو پالے تو اسے حق کا پتہ چل سکتا ہے۔ بالفاظ دیگر

فنا کو سونپ گر مشتاق ہے اپنی حقیقت کا
فروغِ طالع خاشاک ہے موقوف گلخن پہ

اسی با فروغ حقیقت کا پتہ چلانے کے لئے خواجہ صاحب کا ارشاد ملاحظہ ہو

فاش فرید اسے وعظ سناتوں عالم جاہل شاہ گدا کوں
جے کوئی چاہے فقر فنا کوں اپنے آپ کوں گوے

صوفیائے کرام کائنات کو خدا کا عین بتاتے ہیں اور اس نظریے کے ثبوت میں قرآن مجید کا یہ ارشاد پیش کرتے ہیں نحن اقرب الیہ من حبل الورید یعنی ہم انسان کی شہ رگ سے بھی زیادہ قریب ہیں۔ وہ کہتے ہیں چونکہ انسان اور خدا میں اتنا زیادہ قرب ہے اس لئے انسان میں صفات ربانی کا ہونا ضروری ہے۔ لہٰذا اگر انسان اپنی ذات کا عرفان حاصل کرلے تو اسے خدا کا عرفان ہو سکتا ہے۔ یعنی "من عرف نفسہ فقد عرف ربہ۔ جس نے اپنے نفس کو پہچانا اس نے اپنے رب کو پہچانا۔ چنانچہ میر تقی میر کہتے ہیں

پہنچا جو آپ کو تو میں پہنچا خدا کے تئیں
معلوم اب ہوا کہ بہت میں بھی دور تھا

خواجہ غلام فرید نے اسی فلسفے کو ان شعروں میں بیان کیا ہے۔

جو کوئی چاہے علم حقائق راز لدنی کشف وقائق
تھیوے اپنے آپ دا شائق سٹ نزدیکی دوری نوں

ترجمہ:۔ جس شخص کو علم حقائق کی تلاش ہو اور راز لدنی اور کشف دقائق کی طلب ہو وہ دُور و نزدیک کا خیال ترک کر کے اپنی ذات کا شائق ہے۔

خواجہ غلام فریدؒ ایک سالک کے رنگ میں

حقیقت کو معلوم کرنے اور معرفتِ نفس کے حصول کے لیے سلوک کی تین منازل ہیں۔ پہلی منزل فنا فی الشیخ کی ہے جہاں سالک ہر چیز میں شیخ کا جلوہ دیکھتا ہے اور شیخ کے سوا کسی چیز کو موجود نہیں سمجھتا۔ دوسری منزل فنا فی الرسول کی ہے جس میں سالک اپنے آپ کو حقیقتِ محمدیہ میں جذب اور مستہلک پاتا ہے اور جملہ موجوداتِ خارجی میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ہی وجود اسے نظر آتا ہے۔ تیسری اور آخری منزل فنا فی اللہ کی ہے جہاں سالک پر وحدت الوجود کی حقیقت کھل جاتی ہے اور وہ جملہ اشیاء میں اللہ تعالیٰ کی ذات کو ہی موجود دیکھتا ہے۔ اور شہود میں سوائے اللہ تعالیٰ کی ذات کے اور کسی کو موجود نہیں پاتا۔ یہاں پہنچکر وہ ہمہ وست کا نعرہ لگاتا ہے

خواجہ غلام فرید نے بھی سلوک کی یہ منازل طے کی تھیں۔ ان کا کلام جو تصوف کے جملہ رموز و نکات سے لبریز ہے سلوک کی ان منازل کی نشاندہی کرتا ہے۔

فنا فی الشیخ خواجہ صاحب اپنے بڑے بھائی خواجہ غلام فخرالدین کے مرید تھے۔ انہیں اپنے بھائی اور پیر سے بڑی والہانہ محبت اور عقیدت تھی۔ انہوں نے سلوک و طریقت کے تمام رموز ان سے

سیکھے تھے۔ اس روحانی تعلیم کا ان پر یہ اثر ہوا کہ پیر و مرید میں عشق کا رشتہ قائم ہوگیا اور یہ رشتہ پھر اس قدر گہرا ہوا کہ خواجہ صاحب فنا فی الشیخ کے مقام پر پہنچ گئے۔ یہی وجہ ہے کہ جب وہ اپنے کلام میں اپنے پیر و مرشد کا ذکر کرتے ہیں۔ تو ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے کوئی عاشق اپنے معشوق سے باتیں کر رہا ہے انہیں اس عشق پر بڑا ناز بھی تھا۔ وہ کہتے تھے۔ عشقِ مرشد کے طفیل "فقر" کا جو مرتبہ حاصل ہوا ہے وہ دنیا کی ہر دولت سے افضل ہے۔ چنانچہ ارشاد ہوتا ہے۔

میثاقوں تا روزِ حشر دے　　جود وجود نثار فقر دے
دولت محبت فخر الدین

ترجمہ :- اپنے پیر و مرشد (خواجہ فخر الدین) کی محبت کی دولت نے ایسا مست اور شیدا کر دیا ہے کہ اس فقر پر ازل سے ابد تک عاشق کا جود و وجود دونوں قربان ہیں اور اسی کے طفیل روزِ ازل سے ابد تک ہم نے اپنا سب کچھ فقر کے لئے وقف کر دیا ہے

شوق کی فراوانی دیکھیے :۔

چشماں فخر الدین مٹھل دیاں　　تن من کیتا چور

گھول گھتاں میں فخر جہاں توں　　جنت حور قصور

یار فرید کوں ایویں ساڑیو　　جیویں جلیا کوہ طور

ترجمہ :- (۱) محبوب خوش ادا کی آنکھوں نے تن بدن کو چور کر دیا ہے

(۲) حضرت فخر جہاں پر میں جنت اور اس کی حوریں قربان کر دوں۔

(۳) اے محبوب تو نے فرید کو طور کی طرح جلا دیا۔

جب مرید پر اپنے پیر کا عشق پورے طور پر مسلط ہو جاتا ہے تو اس کیلئے اپنے پیر کے علاوہ کوئی اور چیز وجہ کشش نہیں رہتی۔ وہ اسی کے عشق میں تڑپتا ہے اور اسی کے سوز میں جلتا ہے۔ خواجہ صاحب نے اس کیفیت کا اظہار متعدد شعروں میں کیا ہے۔ چند شعر ملاحظہ ہوں۔

فخر الدین مٹھل دے شوقوں دم دم نکلم دُود

فخرالدین مٹھل دے عشقوں دم دم پیڑ سوائی

دِل فرید دے لوٹن کیتے بنیا فخر الدین

ترجمہ:۔ (۱) پیارے فخرالدین کے شوق میں ہر دم دل سے آہوں کا دھواں نکلتا ہے۔

(۲) پیارے فخرالدین کے عشق میں ہر لمحے درد اور خلش بڑھ رہی ہے۔

(۳) میرے دل کو لوٹنے کے لئے فخرالدین کی صورت بنا دی گئی ہے۔

اس وارفتگی اور شوق بیحد کا سبب بھی خواجہ صاحب کی زبان سے سنئے۔

اے بیکار فرید نبھایا لوہے دانگ ہوں بے مایا
فخر پیئے دی صحبت آیا تھیا ہمسایہ پارس داڑی

ترجمہ:۔ کسی کو نہ بھانے والا یہ بیکار فرید جو لوہے کے مانند بالکل بے مایہ تھا۔ جب سے حضرت فخرالدین کی صحبت میں آیا ہے پارس کا ہمسایہ ہو گیا ہے۔ یعنی کندن ہو کر خالص سونا بن گیا ہے۔

مرشد اگر کامل ہو تو مرید پر عالم ملکوت کے تمام اسرار کھل جاتے ہیں۔ اور اس کے دل کا زنگ دُور ہو کر ضیائے ربانی کی بارش ہونے لگتی ہے۔ ذیل کے بند میں خواجہ صاحب نے اسی حقیقت کی طرف اشارہ کیا ہے۔

فخرِ جہاں ہک ریت سوجھائی ارضی تھیا ہک بار سمائی
ظلمت بن گئی نور و نور

ترجمہ:۔ حضرت فخرِ جہاں نے ایک ایسی ریت سوجھا دی ہے جس سے خاک کا پتلا سماوی مخلوق بن گیا ہے اور دل کی تاریکی نور میں تبدیل ہو گئی ہے۔

ان اشعار سے جہاں خواجہ صاحب کے فنافی الشیخ ہونے کا ثبوت ملتا ہے وہاں یہ بھی اندازہ ہوتا ہے کہ ان کی روحانی تربیت میں ان کے مرشد خواجہ غلام فخرالدین کا بہت ہاتھ تھا۔

فنافی الرسول

خواجہ صاحب فنافی الشیخ کی منزل سے گذر کر فنافی الرسول کی منزل میں قدم رکھتے ہیں۔ سالکانِ راہ طریقت کے لئے یہ منزل بڑی احتیاط کی طلبگار ہوتی ہے۔ یہاں اگر ذرا بھی پاؤں میں لغزش آ جائے تو تمام ریاضت اور محنت اکارت چلی جاتی ہے اسی لئے تو کہا گیا ہے۔

با خدا دیوانہ باش و با محمد ہوشیار

خواجہ صاحب نے سلوک کی یہ راہ بڑی احتیاط سے طے کی۔ اور منزل رسی کے شوق میں کوئی قدم ایسا نہیں اٹھایا جو شانِ محمدیہ کے خلاف ہو۔ وہ اس راہ میں سر کے بل جاتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔ حقیقت محمدیہ

کی تفسیر خواجہ صاحب کے الفاظ میں سنئے

حسن ازل دا تھیا اظہار　　احدوں دیس وٹا تھی احمد

ترجمہ:۔ ذات الٰہی کے مظاہر اور حسن ازل کے نور کی شعاعیں ظاہر ہوئی ہیں جو ذات پاک احمد صلی اللہ علیہ وسلم کے بھیس میں دنیا کی تعلیم و ہدایت کے لئے مبعوث ہوئی ہیں۔ یعنی حسن الٰہی کے مناظر نے حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات پاک میں اپنا رنگ دکھایا ہے۔

اس حسن ازل کا مرتبہ بھی ملاحظہ کیجیئے:۔

سلب ثبوت جتھاں مسلوبے　　اوتھ نا طالب نا مطلوبے

ہے لا یدرک الابصار　　بحد مطلق، مطلق بے حد

ترجمہ:۔ حسن ازل کا مقام اس قدر بلند اور ادراک انسانی سے اس قدر ارفع و اعلےٰ ہے کہ وہاں اثبات و نفی۔ ثبوت، عدم ثبوت، طالب، مطلوب کی جگہ نہیں ہے یہ نسبتیں اور عاشق و معشوق کے تمام رشتے وہاں تک نہیں پہنچ سکتے۔ ذاتِ احدیت تو ادراک بصر سے ماوراء اور بلند تر ہے کس کو بے حد مطلق اور مطلق بے حد کہا جا سکتا ہے۔ یعنی وہ حدِ اطلاق سے بہت دور ہے اور کسی چیز کا اس پر اطلاق نہیں ہو سکتا۔

حسن حقیقی نے جب آشکار ہونا چاہا تو ذات محمدیہ میں جلوہ گر ہوا۔

غیب الغیب دے دیسوں آیا　　شہر شہادت دیرا لایا

احدیت دا گھنڈ اتارا　　تھیا اطلاقوں محض مقید

ترجمہ:۔ غیب الغیب کے دیس سے شہادتِ شہود کے منظر عام میں آکر قیام کیا ہے۔ اور ذاتِ باری تعالیٰ کے اسرار قدرت اور رموز فطرت کا حجاب اتار کر

ذاتِ مطلق کے حسن کو ظاہر کیا ہے۔ اور محض مقید کی قیود سے آگاہی بخشی ہے۔

ایسی راسخ الرتبت شخصیت سے عشق کا دم بھرنا آسان کام نہیں۔ خاص طور پر جب اس عشق کی کیفیت کا اظہار شعروں میں مطلوب ہو تو حزم و احتیاط کے تمام تقاضوں کو پورا کرنا پڑتا ہے۔ خواجہ صاحب معاملے کی اس نزاکت کے علاوہ آدابِ عشق سے بھی پوری طرح واقف تھے۔ دیکھیئے یہ کافی سوز و ساز عشق سے لبریز ہونے کے ساتھ ساتھ حفظ مراتب کی کتنی عمدہ تصویر ہے۔

اتھاں میں مٹھڑی جند جان لبب — اوتاں خوش وسدا اوچ ملک عرب

ترجمہ: یہاں میں قسمت کی ماری جاں بلب ہوں۔ اور اُدھر (میرا محبوب) ملک عرب میں شاد و آباد ہے۔

تیڈے دھکڑے دھوڑے کھاندڑی ہاں — تیڈے نام توں مفت وکاندڑی ہاں

تیڈی باندیاں دی میں باندڑی ہاں — ہے در دیاں کُتیاں نال ادب

ترجمہ: اگرچہ تیری محبت کی راہوں میں دھکے کھا رہی ہوں۔ مگر تیرے نام پر تو مفت بکی ہوئی ہوں اور تیری کنیزوں کی کنیز ہوں۔ بلکہ تیرے در کے کتوں کا بھی ادب کرتی ہوں

واہ سوہناں ڈھولن یار سجن — واہ ساتول ہوت حجاز وطن

آ ڈیکھ فرید دا بیت حزن — ہم روز ازل دی تانگھ طلب

ترجمہ: اے پیارے محبوب اور حسین حجازی معشوق تیرے کیا کہنے ہیں۔ ذرا اپنے فرید کا بیت الحزن تو آکر دیکھ۔ اسے تو روز ازل سے تیری طلب اور تیرا انتظار ہے۔

جب عاشق کے دل میں اپنے محبوب سے ملاقات کی امید بندھتی ہے

تو خوشی سے اس کا عجیب حال ہو جاتا ہے۔ ہر چیز حسین اور پُر کشش معلوم ہونے لگتی ہے۔ یہاں تک کہ زیور اور زیب و زینت کا تمام سامان جو فراقِ دوست میں کانٹوں کی طرح چبھتا تھا۔ بھلا معلوم ہونے لگتا ہے ذیل کی کافی میں یہی کیفیت بیان کی گئی ہے۔

اج زیور پیئے ٹھندے ہن
متاں ڈینہہ سہاگ دے آندے ہن

ترجمہ:۔ آج گہنے زیب دے رہے ہیں۔ شاید سہاگ کے دن آ رہے ہیں

کجلہ مارو دیداں بھالے   سُرخی مسک مسک غم ٹالے
بولے بینے تے کنٹھالے   سبھوں لچکے کھاندے ہن

ترجمہ:۔ خونی کاجل نگاہ لطف سے دیکھ رہا ہے اور سرخی متبسّم ہو کر غم کو دُور کر رہی ہے۔ ناک اور پیشانی کے زیور اور کنٹھے خود بخود لچک کر زینت افزائی کر رہے ہیں۔

بادِ شمالی لُرکے لُرکے   بارش رم جھم پُر کے پُر کے
اکھیاں پھڑکن تُوں تُوں مُرکے   ٹھر گئے گوشے ہاں دے ہن

ترجمہ:۔ بادِ شمالی آہستہ آہستہ چل رہی ہے۔ رم جھم رم جھم مینہ برس رہا ہے۔ آنکھیں پھڑک رہی ہیں اور بدن کا رواں رواں شگفتہ ہے۔ دل کے گوشوں میں ٹھنڈک پڑ رہی ہے

بادِ شمالی کی آہستہ خرامی۔ رم جھم رم جھم مینہ کا برسنا۔ بدن کا رواں رواں شگفتہ ہونا۔ آنکھوں کا پھڑکنا اور دل کے گوشوں میں ٹھنڈک محسوس کرنا سب خوشی کی آمد کے آثار ہیں۔ یہ خوشی معلوم ہے کس بات کی ہے۔ کسی مجازی محبوب کے آنے کی نہیں۔ بلکہ اس محبوبِ خدا کے دیس میں جانے کی ہے جسے خواجہ صاحب

جملہ موجوداتِ خارجی میں جلوہ آرا پاتے ہیں۔ غالباً یہ کافی خواجہ صاحب نے حج بیت اللہ کے موقع پر لکھی تھی۔ اس میں سرزمین عرب سے اپنی عقیدت اور وہاں پہنچنے کی خوشی کا اظہار بڑے والہانہ انداز میں کیا ہے۔ دیکھئے زیارت بیت اللہ سے مشرف ہونے پر کس قدر مسرور و شاداں ہیں۔

جیندے عرب شریف ڈٹھو سے   لہندیں سکدیں تاں مر گیو سے
سوہنے سانول یاد کتو سے   ہار سنگار سہاندے ہن

ترجمہ:۔ ہم نے زندگی میں عرب شریف کو دیکھنے کی سعادت حاصل کرلی۔ انتظار اور امید میں مر نہ گئے۔ خوبصورت سانولے یار نے یاد فرمایا ہے۔ اس لئے ہار اور سنگار زیب دے رہے ہیں۔

ذرا سرزمین عرب کی تعریف بھی سُن لیجئے۔

وادیاں راہ مدینے والیاں   ساگی باغ بہشتی چالیاں
ہر ہر آن سدا خوش حالیاں   سکھ سہرے ڈکھ ماندے ہن

ترجمہ:۔ رہ یثرب کی مبارک وادیاں باغ بہشت کی طرح معلوم ہوتی ہیں۔ یہاں ہر آن خوشحالی کا دور دورہ ہے۔ آرام و راحت بڑھے ہوئے ہیں۔ اور تکلیفیں بیمار (دور) ہو گئی ہیں۔

سچی محبت کی یہ نشانی ہوتی ہے کہ انسان اپنے مطلوب کے علاوہ ہر چیز سے بیگانہ ہو جاتا ہے۔ خواجہ صاحب چونکہ فنا فی الرسول کے مقام سے گذر رہے تھے اس لئے جب وہ سرزمین عرب میں پہنچے ہیں تو انہیں اپنا وطن اور وہاں کے لوگ بھی یاد نہیں رہتے۔

عرب شریف دی سوہنی ریتے لاوے دل توں پرم پلیتے
وسرے چاچڑ صدقے کیتے اصلوں محض نہ بھاندے ہن

ترجمہ:۔ عرب شریف کی عمدہ رسم ہے کہ دلوں کو محبت کے فلیتے لگا دیتی ہے چاچڑاں کے لوگ اب اچھے نہیں لگتے۔ انہیں دل سے بھلا دیا ہے۔

یہ خود فراموشی اور محویت بے سبب نہ تھی۔ جس سرزمین پر خواجہ صاحب قدم رکھے ہے تھے اسے اس نورانی ہستی کے وطن ہونے کا فخر حاصل تھا جس نے نور ہدایت سے کفر و ضلالت کے اندھیروں میں روشنی پھیلائی تھی۔ جبھی تو وہ اسے حسن وجمال کی دھرتی سے تعبیر کرتے ہیں۔

حسن جمال دی دھرتی آئی سبھ شے چاہری طرز ڈکھائی
فرحت روز فرید سوائی ڈوکھڑے ماندے ساندے ہن

ترجمہ:۔ حسن وجمال کی سرزمین آگئی۔ ہر شے خوشنما لگ رہی ہے۔ اے فرید خوشی روز افزوں اور درد بیمار ہیں۔ (ختم ہو رہے ہیں) یعنی دُکھ اس وقت تک دکھ تھا جب دیار محبوب تک رسائی کا سامان نہ ہُوا تھا۔ دیار محبوب میں پہنچتے ہی خوشیاں انگڑائیاں لینے لگیں اور رنج وغم مفقود ہو گئے۔

یہ کیفیت تو وصال دوست کی تھی۔ اب ذرا ہجر دوست کا رنگ دیکھئے خواجہ صاحب جب حج بیت اللہ سے واپس ہوتے ہیں تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ غموں کا پہاڑ ان پر آن پڑا ہے

اج سانوں لڑے مکلایا سر یار ڈکھاندا چایا

ترجمہ:۔ آج محبوب رخصت ہو رہا ہے۔ سر پہ رنج وغم کا بوجھ آن پڑا ہے

جو رنج و غم سرزمین عرب میں داخل ہوتے ہی خاطر سے محو ہو گئے تھے اب وہاں سے رخصت ہوتے وقت پھر یاد آنے شروع ہو گئے ہیں۔

کریا د حریم حرم کوں رکھ پیش پرانے غم کوں
دل آکھے کھاواں سم کوں ہے جیون کوڑا جیایا

ترجمہ:۔ حرم کے احاطے کو یاد کر کے سب بھولے بسرے غم یاد آ رہے ہیں۔ اب دل کی یہ حالت ہے کہ زہر کھا کر مر جانے کو جی چاہتا ہے جینا جھوٹ اور فریب معلوم ہوتا ہے

بن یار فرید نجر ساں رت رو رو آہیں کرساں
غم کھا کھا اوڑک مرساں ڈکھ ڈکھڑیں جھیڑا تایا

ترجمہ:۔ اے فرید! محبوب کے سوا کس طرح گذار سکوں گا۔ آہیں کروں گا اور خون کے آنسو روتا رہوں گا۔ آخر اسی غم میں مرنا ہو گا۔ کیونکہ دکھوں نے جی کو مشکل میں پھنسا رکھا ہے

فنا فی اللہ

فنا فی الشیخ اور فنا فی الرسولؐ کی منزلوں سے گذر کر خواجہ صاحب، فنا فی اللہ کے مقام پر پہنچتے ہیں۔ سلامت روی اور ثابت قدمی یہاں بھی ان کا ساتھ دیتی ہے اور اس راہ کی تمام دشواریاں جذبِ صادق اور صحیح رہنمائی کے طفیل آسان ہو جاتی ہیں۔ چنانچہ کہتے ہیں

عقل فکر سب فہم گمائے گر تے پورے بید بتائے

مدہوشی وچ ہوش سکھائے   سارا سفرِ عروج سمجھایا

ترجمہ:۔ شیخ طریقت نے راز کی تمام باتیں بتا دی ہیں۔ عقل فکر اور سمجھ سب گم ہو گئے ہیں اور ایسی مدہوشی طاری ہوئی ہے کہ حقیقی ہوش میسر آ گیا ہے اور روحانی ترقی کے سفر کا معاملہ سمجھ میں آ گیا ہے

سالک کو اگر پیر کامل مل جاتے تو منزلِ مقصود تک رسائی آسان ہو جاتی ہے۔ خواجہ صاحب اس باب میں خوش قسمت تھے۔ انہیں پیر بھی وہ ملا جس نے روحانی تربیت کے فرائض ہی ادا نہ کئے بلکہ بچپن کی خور و پرداخت کی ذمہ داریاں بھی پوری کیں۔ اس تعلق خاطر نے مرید کو خاص توجہ کا مرکز بنایا جس کے نتیجے میں برسوں کا کام دنوں میں مکمل ہو گیا۔

تھئے واضح مشہود دقائق   تھئے لائح انوار حقائق
ظاہر گجھ سب کجھ دے لائق   قرب تے بعد دا فرق اٹھایا

ترجمہ:۔ راز کی باتیں جو نہایت باریک ہوتی ہیں مشاہدے میں آ گئیں حقیقتوں کے نور بالکل ظاہر ہو گئے۔ پوشیدہ باتیں کھل گئیں اور دور و نزدیک کا فرق مٹ گیا۔

یہ کشف قلوب کا مرحلہ تھا جسے طے کرنے کے بعد مشاہدے کی مستی طاری ہو جاتی ہے۔

بنسی خوب بتایاں باتاں   گجھڑے راز انوکھیاں گھاتاں
گم تھیاں کوڑیاں ذات صفاتاں   من الملک دا دورہ آیا

ترجمہ:۔ اللہ کی بانسری نے خوب باتیں بتائیں۔ پوشیدہ راز اور انوکھی

گھاتیں اس نے سمجھا دیں۔ جھوٹے ذات صفات جو ہم نے بنا رکھے تھے سب گم ہو گئے اور وہ دور آ گیا جب خدا تعالیٰ فرمائے گا۔ آج ملک کس کا ہے اور جواب میں صرف یہی کہا جائے گا کہ ایک خدا کا جو سب پر غالب ہے۔

یہیں سے تصوف میں توحید وجودی کا تصور پیدا ہوتا ہے۔ خواجہ صاحب نے اس تصور کو حقیقت کا جامہ پہنانے کے لیئے اس میں عشق کا رنگ بھرا اور اسمیں ایسا نکھار پیدا کیا کہ عشق مجازی کا سوز و ساز اس عشق کے تعلیلے میں بے کیف نظر آنے لگا۔ محبوب حقیقی کی جلوہ سامانیاں ملاحظہ ہوں

تیڈے نیناں تیر چلایا تیڈی رمزاں شور مچایا
لکھ عاشق مار گنوایا الست ہزار مرایا

ترجمہ :۔ اے محبوب تیری آنکھوں نے تیر چلائے اور تیرے اشاروں نے شور برپا کر دیا۔ ہزاروں مست اور لاکھوں عاشق تیری خاطر مارے گئے

یہ عاشقانِ سر بازہ کون تھے ذرا ان کی تفصیل بھی دیکھتے چلیئے۔

ابراھیم اڑاہ اڑایو بار بہ زوں سر چایا
صابر دے تن کیڑے نچھے موسے طور جلایا
ذکریا کلوتر چیرایو تھیا گھوٹ کوہایا
یونس بیٹھ مچھی دے پایو نوح طوفان لڑھایا
شاہ حسن کوں شہر ملیندے زہر دا جام پلایا
شمس الحق دی کھل لہوایو سرمد سر کٹوایا
شاہ منصور چڑھایو سولی مستی سانگ رسایا

مجنوں کارن لیلےٰ ہو کر سو سو ناز ڈکھایا
خسرو تے فرہاد دی خاطر شیریں نام دھرایا

حق پر قربان ہونے والوں کا یہ ذکر جبس تفنن طبع کے لیے نہیں کیا گیا بلکہ ان مثالی کرداروں کو سامنے رکھکر اپنے عشق کا جواز پیش کیاہے اور ساتھ ہی سننے والوں پر بھی یہ واضح کر دیا ہے کہ آلام و مصائب کے بغیر کامیابی حاصل نہیں ہوتی یہ دو شعر اس حقیقت کے غماز ہیں

درد دا بار اٹھایا ہر ہک اپنا وقت نبھایا
کر قربان فرید سر اپنا تیڈرا وارا آیا

ترجمہ :- ہر ایک نے درد کا بار اٹھا کر اپنا وقت پورا کر لیا۔ اے فرید! اب تیری باری ہے۔ تو بھی قربان ہونے کے لئے تیار ہو جا۔

عشق کے اس مقتل میں قدم رکھنے کے بعد سالک سرمست وحدت ہو جاتا ہے اسے ہر چیز میں خدا کا جلوہ دکھائی دینے لگتا ہے

وَد وَد سوہنڑے دا ورتارا ہر صورت وچ کرے اوتارا
ہک جا چاوے عشق اجارا بئی جا ڈیوے حسن ادہارا

ترجمہ :- محبوب کا عجیب برتاؤ ہے۔ ہر صورت میں اسی کا جلوہ ہے۔ ایک جگہ تو اس نے عشق کا اجارہ لیا ہوا ہے اور دوسری جگہ حسن کو ادھار دے رہا ہے۔ یعنی کہیں تو عاشق کی صورت میں جلوہ گر ہے اور کہیں معشوق حسن فروش کے رنگ میں موجود ہے۔

انسانی صورتوں میں ہی نہیں کل اشیائے کائنات میں وہی ذاتِ واحد

نظر آتی ہے۔

کتھ پھل گل باغ بہار ڈٹھم   کتھ بلبل زار نزار ڈٹھم
کتھ خس خاشاک تے خار ڈٹھم   ہک نور دے سید اطوار ڈٹھم

ترجمہ :۔ باغ و بہار ہوں یا گل و غنچہ سب میں اس کی قدرت نظر آتی ہے۔ بلبل بھی اسی کے راگ الاپتی ہے۔ گل ہوں یا خس و خاشاک اور کانٹے سب ہی ایک ہی نور ہے اور اسی کے مختلف اطوار اور طریقے ہیں

یہ نظارے استعارے کے طور پر نہیں بلکہ چشم حقیقت بیں کو صاف دکھائی دیتے ہیں شرط یہ ہے کہ عشق کا دل پہ پورا پورا تسلط ہو۔

عشق فرید تصرف کیتا   لائیں جرڑ کر بدم پلیتا
سب صورت سبحان   ظاہر اکھیاں نال ڈبیندے

ترجمہ :۔ اے فرید عشق نے اپنا پورا قبضہ مجھ پر کر لیا ہے اور مضبوطی سے بدم پلیتہ لگا کر جلا ڈالا ہے اب یہ صورت ہے کہ ہر صورت میں محبوب کا جلوہ صاف صاف آنکھوں سے دکھائی دیتا ہے۔

آلام و مصائب سلوک کی جن راہوں کا ذکر اوپر کیا گیا ہے۔ انہیں طے کرنا آسان نہیں۔ ان میں طرح طرح کے مصائب اور دقتوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ اگر سالک راستے کی ان دشواریوں میں پھنس جائے تو منزل مقصود پر کیسے پہنچے۔ لہذا صوفیا کو تسلیم و رضا کی تعلیم دی جاتی ہے جس کی وجہ سے وہ ہر تکلیف اور غم کو ہنسی خوشی برداشت کرنے کے عادی ہو جاتے ہیں یہانتک کہ پھر ایک منزل ایسی آتی ہے کہ

انہیں درد و اضطراب اور غم و اندوہ میں خاص قسم کی لذت محسوس ہونے لگتی ہے۔ یہ لذتِ غم ہی آخر میں پختہ کاری کی دلیل سمجھی جاتی ہے اور صوفیا اس مقام پر پہنچنے کے لیے مصائب و آلام کو دعوت دیتے ہیں۔

خنجر سے چیر سینہ اگر دل نہ ہو دو نیم
دل میں چھری چبھو مژہ گر خونچکاں نہو

غم کوشی کی یہ تمنا ترکِ علائق کا باعث ہوتی ہے۔ آبادی سے کنارہ کش ہو کر جنگلوں اور پہاڑوں کی راہ اختیار کی جاتی ہے عیش و آرام کو ترک کیا جاتا ہے اور ہر آسانی کو دشواری میں تبدیل کر کے اپنے نفس کو اس سے اس قدر مانوس کر لیا جاتا ہے کہ رنج و غم آرام و راحت کا جامہ پہن لیتے ہیں۔ مرزا غالب نے کیا خوب کہا ہے۔

رنج سے خوگر ہوا انساں تو مٹ جاتا ہے رنج
مشکلیں اتنی پڑیں مجھ پر کہ آساں ہو گئیں

خواجہ صاحب کے ہاں اس مشکل پسندی کی صد ہا مثالیں ملتی ہیں۔ انہوں نے عملی طور پر اپنی زندگی آلام و مشکلات میں مبتلا کی اور تمام عیش و راحت کو خیرباد کہہ کر درد و غم کو اپنے سینے سے لگایا۔

چنانچہ کہتے ہیں۔

پئے ڈوکھ گل وچ جمدے یار   نارہ گیوسے کہیں کم دے یار

ترجمہ:۔ پیدا ہوتے ہی دکھ درد ہمارے گلے کا ہار ہو گئے ہیں۔ ہم کسی کام کے نہیں

رہے ہیں۔

باغ بہار اجاڑ کیتو سے ۔ ہار سنگار وسار ڈتو سے
دولت دنیا وار چھنو سے ۔ نوکر تیڈے دم دے یار

ترجمہ :۔ اے محبوب ہم نے باغ و بہار ویران کر دیئے۔ اپنی زیب و زینت فراموش کر بیٹھے اور اپنی دولت اور دنیا قربان کر کے صرف تیرے نوکر بن کر رہ گئے ہیں۔

لانڑے پھوگ اساڈے ملّے ۔ ٹیڑے ٹھٹڑے ڈھیر لکانڑے
ڈسدے سکڑے کھیتر کمانڑے ۔ ساگی باغ ارم دے یار

ترجمہ :۔ روہی کے بوٹے ، لانڑے اور پھوگ ہمارے لئے مایہ ناز ہیں۔ ٹیلے ٹیبے۔ بھٹ اور ڈھیر ہمارے مسکن ہیں۔ سوکھے ہوئے اور کملائے ہوئے کھیت ہم کو سرسبز اور اصلی باغ بہشت جیسا لطف دیتے ہیں۔

خواجہ صاحب نے لذتِ غم کے یہ تجربات روہی جیسے ریگستان ہی میں کئے تھے۔ جہاں تپتی ہوئی ریت اور جھاڑیوں اور کانٹوں کے سوا زندگی کا دور دور نشان نہیں ملتا۔ ذیل کی کافی میں یہی منظر پیش کیا گیا ہے۔

اوتھ درد منداں دے دیرے ۔ جتھ کرڑ کنڈا بوئی ڈھیرے

ترجمہ :۔ اس ریگستان میں جہاں کریہ کے درخت اور خاردار جھاڑیاں ہیں۔ وہاں دردمندوں کا قیام ہے۔

اے اچے ٹبڑے عالی ۔ اے سوہنی ککڑی والی

ہن مشتا قاں دے والی   بیا کون قدم اتھ پھیرے

ترجمہ:- یہ اونچے اونچے بلند ٹیلے۔ یہ خوبصورت خوش رنگ بھورن ریت یہی عشاق کی دلبستگی کا باعث ہیں۔ ان کے سوا یہاں کون قدم رکھ سکتا ہے۔

بھڑ شہر بزار عمارت   ہیوا ہی ، برہوں بشارت
ہر بے شک عشق اشارت   چھوڑ جھگڑے کوڑے جھیڑے

ترجمہ:- تمام شہر کی عمارتوں اور بازار کو آگ لگا دو۔ ہماری بے سرو سامانی عشق کا پیغام ہے۔ بے شک یہ عشق ہی کے اشارات ہیں۔ جھگڑے اور جھوٹے فساد چھوڑ کر صرف حضرت عشق کے ہو رہو۔

حقیقت میں یہ عشق کی لذت انگیزی ہی ہے جو غم و آلام۔ مصائب اور دشواریاں بھلی معلوم ہونے لگتی ہیں۔ عاشقان کامل کے علاوہ اس امتحان میں کون پورا اتر سکتا ہے۔ اصغر گونڈوی نے کیا خوب کہا ہے۔

چلا جاتا ہوں ہنستا کھیلتا موجِ حوادث میں
اگر آسانیاں ہوں زندگی دشوار ہو جائے

زندگی کی دشواریوں کو آسان سمجھنا اور موجِ حوادث سے ہنستے کھیلتے چلے جانا۔ خواجہ صاحب جیسے دھن کے پکے عاشقوں کا ہی کام تھا۔ جنہوں نے چولستان جیسے ویران و پر وحشت مقام پر اٹھارہ سال زندگی کے دن گذار کر اپنی استقامتِ پا کا ثبوت دیا۔ ان کا اعتقاد تھا کہ اگر درد و الم تلاش حق کے نتیجے میں میسر آئے تو اس سے زیادہ مفید و لذت بخش چیز اور کوئی نہیں ہو سکتی کیونکہ یہی وہ کیفیت ہے جو ماسوا کی

تمام آلائشوں کو پاک و صاف کر دیتا ہے۔ چنانچہ فرماتے ہیں

درد فرید ہمیشہ ہووے　　سارے پاپ دوئی دے دھووے

رہندی تانگھ تے تانگھ　　پہنچاں پریم نگر وچ

ترجمہ: اے فرید یہ درد ہمیشہ رہے کیونکہ اس سے دوئی کی تمام آلائشیں صاف ہو جاتی ہیں۔ اب یہی انتظار ہے کہ میں پریم نگر میں کب پہنچتا ہوں۔

انسانی مرتبہ خواجہ صاحب کی نظر میں

قرآن حکیم کی سورۂ لقمان میں آیا ہے کہ

"کیا تم نے اس پر غور نہیں کیا کہ جو کچھ آسمانوں اور زمینوں میں ہے وہ سب کچھ خدا ہی نے تمہارا تابع کر دیا ہے۔ اور تم پر اپنی ظاہری و باطنی نعمتیں تمام کر دی ہیں۔"

یہ آیت مخلوقِ خدا میں انسان کی افضلیت اور برتری کو ظاہر کرتی ہے۔ اس کے علاوہ انسان کے اشرف المخلوق ہونے کی دلیل اس واقعہ سے بھی دی جاتی ہے کہ خدا نے فرشتوں کو اس کے آگے سجدہ کرنے کا حکم دیا اور ابلیس کو جو معلم الملکوت تھا محض اس جرم کی پاداش میں ہمیشہ کے لیے معتوب و راندۂ درگاہ کر دیا گیا کہ اس نے آدم کو سجدہ کرنے سے انکار کر دیا تھا۔

اہلِ تصوف نے انسانی عظمت کے اس پہلو کو نمایاں کرنے کی خاص طور پر کوشش کی۔ کیونکہ اس سے ان کے نظریۂ وحدت الوجود کو تقویت پہنچتی تھی۔ انہوں نے انسان کو آئینۂ فطرت کے اصل جوہر سے تعبیر کیا اور یہ بتایا کہ اس کا اصل مقام عالمِ قدس میں ہے جہاں فرشتے پر و بال کے

باوجود پہنچنے کی جرأت نہیں کر سکتے

یا وجود یچہ پر وہاں نہ تھے آدم کے
واں پہ پہنچا کہ فرشتوں کا بھی مقدور نہ تھا

انسانی مرتبہ کی اس نشاندہی کے بعد یہ ضروری تھا کہ انسان کو اس کے وقار نفس کا احساس دلایا جاتا اور پستی و حقارت کے وہ تصورات جو غلط طور پر انسان کی ذات کے ساتھ منسوب ہو گئے ہیں انہیں دور کیا جاتا۔ چنانچہ صوفیائے کرام نے انسان کو اس کی حقیقت سے آشنا کرنے کے لیے اس کی سربلندی اور عظمت کے پہلوؤں کو روشن کیا اور یہ بتایا کہ اگرچہ وہ اپنی ساخت کے اعتبار سے کائنات دعالم صغیر) کا ایک نمونہ ہے لیکن اپنی روحانی عظمت کے لحاظ سے عالم اکبر ہے

مرزا رفیع الدین سودا نے کیا خوب کہا ہے۔

ہم ہی ہیں عالمِ اکبر ہوئے گو جرم صغیر
مظہر جلوۂ حق حضرت انسان ہیں ہم

خواجہ میر درد کہتے ہیں کہ خلق کی مثال ایسے مہمل الفاظ کی ہے جن میں اس وقت تک کوئی معنی پیدا نہیں ہوتے جب تک انسان عالمِ وجود میں نہیں آتا۔

الفاظ خلق ہم بن سب مہملات سے تھے
معنی کی طرح ربطِ گفتار ہیں تو ہم ہیں

خواجہ غلام فریدؒ چونکہ خود بڑے صوفی اور وحدت الوجود کے

مسلک کے علمبرداروں میں سے تھے اس لئے انہوں نے بھی انسانی عظمت کو اپنی کافیوں میں خوب خوب واضح کیا ہے۔ ان کی ایک مشہور کافی ہے

کیوں تو فرد تے جز سڈاویں — توں کُی توں کل

اس میں انہوں نے انسان کو احساس کہتری کا شکار ہونے سے روکا ہے اور اسے اس کے اصل مقام سے آگاہ کرنے کے ساتھ یہ بتایا ہے کہ وہ غلطی سے جزو اور فرد کہلانے پر قناعت کر بیٹھا حالانکہ وہ ہی سب کچھ ہے اور تمام دُنیا اسی کے لئے ہے وہ اس وعظ و نصیحت میں اپنے اصل مسلک وحدت الوجود کو کبھی فراموش نہیں کرتے۔ کہتے ہیں۔

باغ بہشت دا توں ہیں مالک۔ خود بلبل خود گُل

یعنی تو ہی باغ بہشت کا مالک ہے۔ بلبل بھی تُو ہے اور گُل بھی تُو ہے

اس کافی کے چند اشعار اور ملاحظہ ہوں۔

عرش وی تیڈا فرش وی تیڈا۔ توں عالی ان مُل
روح مثال شہادت توں ہیں۔ سمجھ سونجان نہ بھُل
دُنیا عقبےٰ برزخ اندر۔ ناہیں تیڈرا تُل

ترجمہ :۔ تو بہت بلند پایہ اور بے بہا ہے۔ یہ عرش اور فرش تیرے ہی تو ہیں یہ بات اچھی طرح سے ذہن نشین کر لے کہ تمام عالم ارواح مثال و شہود میں۔ تو موجود ہے۔ دُنیا عقبیٰ اور برزخ میں کوئی تیرا ہموزن اور مساوی نہیں ہے۔

خود شناسی کی یہ تعلیم اس لئے نہیں دی جارہی کہ انسان مغرور و متکبر ہو جائے بلکہ مقصود یہ ہے کہ وہ خدا شناس اور عارفِ حقیقی ہو جائے

کیونکہ من عرف نفسہ فقد عرف ربہ اور جب انسان اس حقیقت کو پالے گا کہ خدا اس کی شہ رگ سے بھی زیادہ قریب ہے تو ظاہر ہے وہ اِدھر اُدھر کیوں بھٹکے گا۔ چنانچہ کہتے ہیں

یار فریدا کول ہے تیڈے۔ نال سبے ہو دہ رُل

خواجہ میر درد نے بھی ایسے ظاہر پرستوں پہ جو خدا کو اپنے سے جُدا سمجھتے ہیں اس طرح طنز کیا ہے۔

ڈھونڈتے ہیں آپ سے اس کو پرے
شیخ صاحب چھوڑ گھر باہر چلے

خواجہ صاحب کے کلام میں مذلت و رسوائی کا پہلو

تصوف میں اصلاح نفس کیلئے ملامت کا نظریہ قدیم سے چلا آرہا ہے۔ اس نظریے کے سب سے پہلے مبلّغ شیخ ابو حمدون قصار تھے جو ملامت کو ترک سلامتی کا ذریعہ سمجھتے تھے ان کا خیال تھا کہ سالک ملامت کو اختیار کرنے والا دنیا کی تمام لذتوں سے کنارہ کش ہو جاتا ہے اور اس طرح اس کے پندار و تکبر کا وہ قلع جو طلب حق کی راہ میں رکاوٹ ہوتا ہے۔ مسمار ہو جاتا ہے۔ چنانچہ صوفیا اپنے لئے ملامت کا سامان فراہم کرتے ہیں اور اپنا حال ایسا بنا لیتے ہیں کہ دیکھنے والے ان کی ظاہری صورت کی وجہ سے ان کو قابلِ نفرت سمجھنے لگتے ہیں۔ اس کا یہ فائدہ ہوتا ہے کہ اُن کی باطنی خوبیاں ظاہر ہونے نہیں پاتیں اور تربیتِ نفس کا کام بھی جاری رہتا ہے۔

اسی ملامت و رسوائی کے سلسلہ میں حضرت بایزید بسطامی کا واقعہ بہت مشہور ہے کہ ایک دفعہ وہ سفرِ حجاز سے واپس تشریف لا رہے تھے۔ جب شہر کے قریب پہنچے تو وہاں کے لوگوں نے ان کے خیر مقدم اور پیشوائی کی تیاریاں شروع کر دیں۔ آپ کو جب اس

بات کا علم ہوا تو آپ نے سربازار روٹی کھانی شروع کر دی رمضان المبارک کا مہینہ تھا۔ لوگ یہ دیکھکر برگشتہ ہو گئے اور بجائے تعظیم و تکریم کے لعنت ملامت کرنے لگے۔ گویا اس فعل سے حضرت بایزید بسطامیؒ نے اپنے پندار کو دبا لیا۔

اسی طرح حضرت ابراہیم بن ادھم ایک بار کشتی پر سوار تھے۔ اُن کی خراب و خستہ حالت کو دیکھ کر دوسرے لوگ ان کا مذاق اُڑا رہے تھے۔ اسی اثنا میں دریا میں ایک طغیانی آئی اور کشتی کے ڈوبنے کا خطرہ پیدا ہو گیا۔ ملاح نے کہا کہ اگر مسافروں میں سے کسی ایک کو دریا میں پھینک دیا جائے تو یہ طوفان دب سکتا ہے چنانچہ لوگوں نے حضرت ابراہیم بن ادھم کو اس قربانی کے لئے منتخب کیا اور انہیں کان سے پکڑ کر دریا میں پھینکنے لگے۔ لیکن فوراً ہی دریا پُر سکون ہو گیا اور حضرت ابراہیم بن ادہم ڈوبنے سے محفوظ رہے ان کا کہنا ہے کہ جب ان کا کان پکڑا گیا تو انہوں نے اپنے نفس کو کامیاب پایا۔ اور اس ذلت و خواری سے بہت شاد کام ہوا۔

ملامت و رسوائی کی یہ صورتیں صوفیا دیدہ و دانستہ پیدا کرتے رہتے ہیں۔ خواجہ صاحب بھی جن کے مجد و شرف پر کوئی انگلی نہیں رکھ سکتا اس شوقِ تذلیل میں خود کو ملامت سے دوچار کرتے ہیں۔ اِن کی ایک سے زیادہ کافیوں میں ایسے اشعار ملتے ہیں جنہیں اصلاح نفس کے اسی جذبے سے تعبیر کیا جا سکتا ہے۔ مثال کے طور پہ ایک جگہ فرماتے ہیں

ریت فرید دی پھڑی ساری رہندا صوم وصلواتوں عاری
رندی مشرب ہے مشہور

ترجمہ :۔ فرید کا حال کیا پوچھتے ہو۔ اس کا طریقِ عمل اُلٹا ہے۔ وہ صوم وصلواۃ سے عاری رہتا ہے۔ اس کا مشرب تو رندی ہے۔

ایک اور کافی کا یہ بند بھی قابل ملاحظہ ہے۔

سنو پریتا حال فریدی مذہب ملت ہس توحیدی
میل کچیلا شکل جریدی خوش وسدا پرم دی وستی

ترجمہ :۔ اے دوست فرید کا حال سنو۔ اس کا مذہب و مسلک تو توحیدی ہے مگر میلا کچیلا اور جریدہ حال ہے اور یاس حال محبت کی بستی میں خوش و خرم ہے

ان اشعار کو خواجہ صاحب کی اصل زندگی پر منطبق نہیں کرنا چاہیئے۔ کیونکہ وہ محض پابندِ صوم و صلوٰۃ ہی نہیں بلکہ شریعتِ حقہ کی تمام جزئیات کے بھی عامل تھے۔ عملی زندگی میں دینی مقتضیات کو پورا کرنے کے باوجود ان کا یہ قول کہ وہ جریدہ حال۔ صوم و صلوٰۃ سے عاری اور رند ہیں اس حقیقت کی غمازی کرتا ہے کہ وہ صوفیا کے مذکرہ بالا طریقہ کے مطابق خود کو لوگوں کی نظروں میں گرا کر اپنے نفس کی اصلاح کا سامان فراہم کرتے تھے۔ چنانچہ کہتے ہیں۔

جے توں چاہیں قرب حقیقی ورثہ علوی تے صدیقی
ریت جنیدی رسم شقیقی بھٹ ہستی وٹ ہستی

ترجمہ :۔ اے سالک! اگر تو باری تعالیٰ کا قرب چاہتا ہے اور حضرت علی المرتضیٰ

اور ابو بکر صدیق کے ورثے کا خواہاں ہے۔ حضرت جنید بغدادی اور شفیق بلخی کی رسم کو اپنانا چاہتا ہے تو اپنی ہستی (انانیت) کو بھاڑ میں ڈال کر حقیقی ہستی حاصل کرے۔

خواجہ صاحب کا تصورِ عشق

کسی نے کیا خوب کہا ہے

عشق می گویم و جاں میدہم از لذتِ وے

خواجہ صاحب کے ہاں عشق کی یہ لذت کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔ وہ عشق کو خدا اور خدا کو عشق سمجھتے تھے اور بقول بابا فریدالدین گنج شکر ان کا یہ عقیدہ تھا کہ "عشق ایک آگ ہے جو درویش کے دل کے سوا اور کہیں نہیں ہوتی" اس آگ کو انہوں نے پھولوں کی سیج سمجھا اور اس سے خوب لطف اندوز ہوئے چنانچہ کہتے ہیں۔

قسم خدا دی قسم نبی دی عشق ہے چیز لذیذ عجیب

ترجمہ:۔ خدا اور نبی کی قسم عشق عجیب لذیذ چیز ہے۔

عشق کی یہ لذت ہی ہے جو انسان دکھ درد کو سہہ لیتا ہے۔

لکھ لکھ سول ہزاراں ڈوکھڑے سو سو شکر جو آئم پو کھڑے

بیشک ضرب حبیب ذبیب

ترجمہ:۔ محبت میں اگرچہ لاکھوں درد اور ہزاروں دکھ ہیں۔ مگر میں شکر کے سو سو سجدے بجالاتا ہوں کہ یہ درد و غم قسام ازل نے میری قسمت میں

ودیعت کر دیئے ہیں اور مجھے دوست کی مار بھی خوشگوار معلوم ہوتی ہے۔

ایک مقام پہ قرآن مجید میں آیا ہے کہ" ہم نے اپنی امانت کو سارے آسمان۔ زمین اور پہاڑوں کے سامنے پیش کیا تو انہوں نے اس کو اٹھانے سے انکار کر دیا۔ اس سے ڈر گئے اور آدمی نے اُسے اُٹھا لیا" اہل تصوف کے نزدیک اس آیت میں جس امانت کا ذکر کیا گیا ہے وہ عبادت۔ طاعت اور معرفتِ حق ہے جو عشق کے بغیر ممکن نہیں اور یہ انسان کی بلند ہمتی کی دلیل ہے کہ اس نے اس بارِ امانت کو اپنے ناتواں کندھوں پر اُٹھا لیا

سب پہ جس بار نے گرانی کی
اس کو یہ ناتواں اُٹھا لایا

اس گراں بار ذمہ داری سے سبکدوش ہونے کے لئے عشق کی مے تند سے آشنا ہونے کی ضرورت تھی۔ لہذا صوفیائے کرام مردِ میدان بن کر سامنے آئے اور انہوں نے شراب عشق کے تند و تلخ گھونٹ بخوشی گوارا کر لئے۔

خم گردوں کو ٹک جس کا نہ یارائے تحمل تھا
وہی صہبائے تندِ خُم شکن ہم کو پلا دی ہے

اس خم شکن صہبائے تند کا نشہ خواجہ صاحب کے ان اشعار میں ملاحظہ فرمایئے

دستوں پیر مغاں دے پیتم عشق دا جام

ترجمہ:۔ میں نے پیر مغاں کے ہاتھ سے عشق کی شراب کا پیالہ پیا ہے

وحدت کیتا غلبہ بُھل گیا کفر اسلام

ترجمہ:۔ توحید باری تعالیٰ نے اس قدر مجھ پر غلبہ کیا ہے کہ کفر اور اسلام فراموش ہو گئے ہیں۔

گذ گئے فرض فریضے سنت کو بھی سلام

ترجمہ:۔ فرض اور فریضے تو ختم ہوئے ہی تھے۔ سنت کو بھی ہمارا سلام ہے

یہ نشہ محض عشق کا ہی نہیں عشق حقیقی کا ہے جو تمام اغراض و مقاصد اور احتمالات و شبہات سے مبرا و منزہ ہے۔ اس درجے پر پہنچنے کے بعد انسان کو پرتوِ وحدت کے سوا کچھ نظر نہیں آتا۔ دوئی کے پردے اٹھ جاتے ہیں۔ دوست دشمن کی تمیز ختم ہو جاتی ہے۔ بس محبت ہی ہر سُو جلوہ ریز ہوتی ہے اس مقام پہ پہنچکر سالک انا الحق کا نعرہ لگاتا ہے۔ چنانچہ خواجہ فرید الدین عطار فرماتے ہیں۔

من خدایم من خدایم من خدا مانہ غم از کبر و کینہ وز ہوا

خواجہ غلام فرید بھی اس مئے عشق سے سرشار تھے۔ دیکھیئے کیا قلندرانہ بات کہی ہے

اساں سو بد مست قلندر ہوں کڈیں مسجد ہوں کڈیں مندر ہوں

ترجمہ:۔ ہم اس قدر مست اور قلندرانہ مسلک میں مدہوش ہیں کہ ہمارے سامنے اچھے بُرے کا فرق اُٹھ گیا ہے۔ مسجد ہو یا مندر ہم ہر جگہ اس کی قدرت کا جلوہ دیکھتے ہیں۔

جن کا خمیر مہر و محبت سے اٹھا ہو۔ ان کے نزدیک مسجد اور مندر

کی کوئی تمیز نہیں ہوتی۔ وہ دوزخ اور جنت کے قضیئے سے بھی آزاد ہوتا ہے۔ حکیم عمر خیام نے ذیل کی رباعی میں اسی فلسفے کو بیان کیا ہے۔

ہر کس کہ در دہر و محبت بہ سرشت   گر ساکن مسجد و در اہل کنشت
در دفتر عشق نام ہر کس کہ نوشت   آزاد دوزخ است و فارغ ز بہشت

خواجہ صاحب کا نام بھی عشق و محبت کے دفتر میں درج تھا۔ جبھی تو کہتے ہیں۔

کتھاں صومعہ دیر کنشت کتھاں   کتھے دوزخ باغ بہشت کتھاں
کتھے عاصی نیک سرشت کتھاں   کتھے گمرہ ہوں کتھے رہبر ہوں

ترجمہ:۔ ہماری قلندرانہ نگاہیں خانقاہوں۔ بتخانوں۔ گرجوں اور دوزخ وبہشت میں اسی کا دستِ قدرت دیکھتی ہیں۔ اسی طرح گنہگار۔ نیکوکار۔ گمراہ اور رہنما میں بھی ایک ہی جلوہ ہے۔ یعنی کبھی ہم اس رنگ میں نظر آتے ہیں اور کبھی دوسرے رنگ میں پائے جاتے ہیں۔

اطباء عشق کو "النوع من الجنون" کہتے ہیں۔ لیکن ان کا یہ خیال عشق باطل کے سلسلہ میں ہے جو جسم کثیف سے تعلق رکھتا ہے جہاں تک عشق حقیقی کا تعلق ہے وہ ایک ایسے جذبۂ لطیف کا مظہر ہوتا ہے جس میں خدو خال اور لب و رخسار پر نظر نہیں ہوتی۔

لطیفہ ایست نہانی کہ عشق ازو خیزد
کہ نام آں نہ لب لعل و خط زنگار یست

خواجہ صاحب اسی جذبۂ لطیف کے قائل تھے اور اسی کو حصول مراد کا ذریعہ سمجھتے تھے۔ دیکھئے اس کافی میں اسرار و رموز کے کیسے کیسے دفتر کھول کر رکھ دیئے ہیں۔

بن یار سانول بیو کو نہیں   ہذا جنون العاشقین
بے او نہ آنست و نہ ایں   ہذا جنون العاشقین

ترجمہ:۔ محبوب حقیقی کے سوا اور کوئی مطمح نظر نہیں۔ یہ عشاق کا جنون ہے۔ اس کے بغیر "آں" اور "ایں" کچھ نہیں۔ یعنی ماسوا اللہ کسی چیز پر نظر نہیں ٹھہرتی یہ عشاق کا جنوں ہے

عشق حقیقی کی نشانی یہی ہے کہ عاشق کو سوائے ذاتِ حق کے کچھ نظر نہیں آتا۔ اور وہ علی الاعلان پکار اٹھتا ہے

بخدا غیر خدا در دو جہاں چیزے نیست

خواجہ صاحب اس مضمون کو اس طرح بیان کرتے ہیں

کیا نار کیا گلزار ہے   کیا یار کیا اغیار وے
اد را بداں او را بہ بیں   ہذا جنون العاشقین

ترجمہ:۔ نار و گلزار۔ یار و اغیار سب میں اسی کا ظہور ہے۔ تو اسی کی طرف دیکھ اور اسی کا ہو رہ۔ یہی تو جنونِ عشاق ہے۔

جب عاشق اس جذبے سے پوری طرح سرشار ہو جاتا ہے تو اس پر انوارِ الٰہی کی بارش ہونے لگتی ہے اور اس کا دل عرش بریں بن جاتا ہے۔

واہ عشق ڈتڑی ذات ہے تھی رات سبھ پربھات ہے

شد فرش دل عرشِ بریں ہذا جنون العاشقین کو

ترجمہ:- عشق نے کیسی عنایت کی ہے کہ تمام رات اس خاکی دل میں

تجلیات الہٰی کا دور دورہ ہوتا رہتا ہے۔ گویا یہ عرشِ بریں بن جاتا ہے اور اس

تنزل میں صبح ہو جاتی ہے۔ یہ جنونِ عشاق کا ایک منظر ہے۔

دراصل تصوف مذہب عشق کا ہی دوسرا نام ہے۔ صوفیا جب طالب

کو تزکیہ نفس کی تعلیم دیتے ہیں تو سب سے پہلے عشق و محبت

کا درس دیتے ہیں۔ کیونکہ یہ ایک ایسی صیقل ہے جو تمام زنگوں کو صاف

کر دیتی ہے۔

ہیچ اکسیرہ تاثیر محبت نہ رسد

کفر آوردم و در عشق تو ایماں کردم

اس نظریئے کے ماتحت خواجہ صاحب عشق کو اپنا دین و ایمان

سمجھتے ہیں اور اس باب میں کسی زاہد خشک یا ناصح مشفق کی پروا

نہیں کرتے۔

ناصح ناہی ناتھی مانع عشق اساڈا دین ایمان

ترجمہ:- اے ناصح مجھے مت روک۔ عشق ہمارا دین و ایمان ہے۔

علم و عرفان کا دفتر۔ فقر و درویشی کے رموز اور پریم نگر کا راستہ بھی

عشق ہی کی بدولت معلوم ہوتا ہے

عشق ہے ہادی پریم نگر دا عشق ہے رہبر راہ فقر دا

عشقوں حاصل ہے عرفان

خواجہ صاحب عشق کی فضیلت اس حدیث قدسی سے بھی ثابت کرتے ہیں۔ کُنتُ کنزاً مخفیاً فاحببتُ اَن اعرف فخلقتُ الخلق

یعنی خدا کہتا ہے کہ میں ایک خزانہ مخفی تھا۔ میں نے چاہا کہ پہچانا جاؤں اس لیئے مخلوق کو پیدا کیا۔

کُنتُ کنزاً عشق گواہی پہلوں حب خود ذات کوں آہی
جیں سانگھے تھیا کل جہاں

مطلب یہ کہ عشق ایسی ارفع و اعلیٰ چیز ہے جس کا اظہار پہلے پہل خدا کی طرف سے ہوا اور اس نے اپنے جمال و جلال کے نمود کے لیئے جہان کو پیدا کیا۔

خواجہ صاحب نے عشق کی منزلت کو طرح طرح سے بیان کیا ہے ایک جگہ کہتے ہیں کہ اسی جذبے سے انسان اور حیوان میں امتیاز کیا جا سکتا ہے۔ یعنی اگر کسی میں عشق کا جذبہ نہ ہو تو وہ حیوان ہے۔

باجھ محبت جان برابر کیا ناطق کیا ناہق صاہل

ترجمہ:۔ محبت کے بغیر انسان اور گدھے برابر ہیں۔

میر تقی میر مثنوی "دریائے عشق" میں لکھتے ہیں

کچھ حقیقت نہ پوچھو کیا ہے عشق حق اگر سمجھو خدا ہے عشق
عشق ہے عشق ہے نہیں ہے کچھ عشق بن تم کہو کہیں ہے کچھ
عشق حق ہے کہیں نبی ہے کہیں ہے محمدؐ کہیں علیؓ ہے کہیں

عشق عالی جناب رکھتا ہے　　جبرئیل و کتاب رکھتا ہے

عشق کی یہی جلوہ فرمائی خواجہ صاحب کے ہاں ملاحظہ ہو

ہے عشق دا جلوہ ہر ہر جا　　سبحان اللہ سبحان اللہ
خود عاشق خود معشوق بنْیا　　سبحان اللہ سبحان اللہ

ترجمہ:۔ ہر جگہ عشق کا جلوہ ہے۔ عاشق اور معشوق دونوں کے روپ میں عشق ہی ہے۔ سبحان اللہ کیا شان عشق ہے۔

خود بلبل تے پروانہ ہے　　گل شمع اوتے دیوانہ ہے
کتی چاند چکور نوں ہوہ لیا　　سبحان اللہ سبحان اللہ

ترجمہ:۔ خود ہی بلبل۔ پروانے اور چکور میں جلوہ نگن ہے۔ اور خود ہی معشوقوں گل، شمع اور چاند میں موجود ہے۔ سبحان اللہ۔

کڈیں موسیٰ بنتی میقات چڑھے　　دل وعظ کرے توریت پڑھے
کڈیں عیسےٰ، یحییٰ، ذکریا　　سبحان اللہ سبحان اللہ

ترجمہ:۔ کبھی موسیٰ علیہ السلام کی صورت میں حضرت عشق میقات پر کلام الہٰی سے شرف یاب ہوتے ہیں۔ اور کبھی توریت کا وعظ فرماتے ہیں۔ حضرت عیسیٰ، یحییٰ اور ذکریا علیہم السلام میں بھی اسی عشق کا جلوہ ہے

کتھے راز انا الحق فاش تھیا　　کتھے سبحانی دا ورد پڑھیا
کتھے انی عبد رسول کہیا　　سبحان اللہ سبحان اللہ

ترجمہ:۔ جوشِ عشق میں کہیں منصور کی زبان سے انا الحق نکلتا ہے کہیں بایزید بسطامی سبحانی ما اعظم شانی کا ورد کرتے ہیں اور کہیں رسول کریم

صلی اللہ علیہ وسلم انی عبد اللہ رسولہ کا اقرار فرماتے ہیں۔ سبحان اللہ! کیا عشق کی شان ہے۔

عشق کے مختلف مظاہر کا بیان کرنے کے بعد خواجہ صاحب اہل صفا سے مخاطب ہو کر کہتے ہیں کہ زندگی میں جب تک درد اور سوز نہ ہو جینے کا مزا نہیں۔

ہے پیت فرید دی ریت عجب ہے درد تے سوز دی گیت عجب
سن سمجھو سارے اہل صفا سبحان اللہ سبحان اللہ

ترجمہ:۔ اے اہلِ صفا یہ سُن لو اور سمجھ لو کہ فرید کا شغلِ زندگی محبت سوز اور درد ہے۔ سبحان اللہ یہ کتنی بڑی نعمت ہے۔

علامہ اقبال کا یہ شعر بھی اسی فلسفہ کا آئینہ دار ہے۔

عشق سے پیدا نوائے زندگی میں زیر و بم
عشق سے مٹی کی تصویروں میں سوز دمبدم

خواجہ صاحب اس سوز دمبدم کو زندگی کی خوشیوں کا وسیلہ سمجھتے ہیں اور کہتے ہیں کہ یہ عشق ہی ہے جو ایک مرشد کی طرح مرید کو دُنیا کے تمام اسرار و رموز سے آگاہ کرتا ہے۔

عشق ہے ڈکھڑے دل دی شادی عشق ہے رہبر مرشد ہادی
عشق ہے ساڈا پیر جیں کل راز سمجھایا

وہ علم و عمل میں بھی سوز عشق کے قائل تھے اور یہ اعتقاد رکھتے تھے کہ ظاہری عبادات اور علم دین کا اسی وقت کچھ فائدہ ہو سکتا

ہے جب انسان کے دل میں خدا کی سچی محبت ہو۔ بہ الفاظ دیگر وجد و حال کی دنیا علم و عمل کی دنیا سے افضل ہے۔

جدڑاں عشق فرید استاد تھیا سب علم و عمل برباد تھیا
پر حضرت دل آباد تھیا سو وجد کنوں لکھ حال کنوں

ترجمہ:۔ اے فرید جب ہم نے عشق کے آگے زانوئے تلمذ طے کیا تو علم و عمل کا تمام شغل برباد ہو گیا۔ لیکن یہ بات باعثِ تسکین ہے کہ دل کی بستی وجد و حال سے آباد ہے۔

علامہ اقبال اسی عشق کے متعلق فرماتے ہیں

اگر ہو عشق تو ہے کفر بھی مسلمانی
نہ ہو تو مردِ مسلماں بھی کافر و زندیق

خواجہ صاحب عشق کی اس حقیقت سے محض واقف ہی نہیں۔ بلکہ اسے فقر و درویشی کا راس المال سمجھتے تھے۔ چنانچہ کہتے ہیں۔

نیہہ فرید فقر دی موڑی باجھ برہوں دے کل گل کوڑی
مر ونج جیندیں نیویں پوری دل نوں داغ نہ لاویں وے

ترجمہ:۔ عشق و محبت فقر و درویشی کا راس المال (سرمایہ) ہے بغیر عشق و محبت کے دنیا کی تمام باتیں جھوٹی ہیں۔ اس محبت کو جیتے جی بلکہ مر کر بھی نبھانا اور اسے ایک لمحے کے لئے بھی ترک کر کے دل کو داغ نہ لگانا۔

خواجہ صاحب کے کلام میں مجازی رنگ

وحدتِ مطلقہ کے فلسفے میں جان ڈالنے کے لیے روحانی ارتقاء کو ضروری قرار دیا گیا تھا۔ اور اس غرض کے لیے محبت کی تعلیم دی گئی تھی کیونکہ یہی وہ جذبہ تھا جو دوسرے تمام جذبات پر غالب آسکتا تھا۔ اس میں استغراق محویت اور بیخودی کی جو کیفیت پیدا ہوتی ہے اس سے انسان کو خدا کا قرب حاصل ہونے میں مدد ملتی ہے۔

جب قرب خدا کے لیے محبت ضروری قرار پائی تو یہ سوال پیدا ہوا کہ ایک ان دیکھی حقیقت سے کس طرح لو لگائی جائے۔ چنانچہ مجازی اشیاء جو اصل میں حقیقتِ کاملہ ہی کی مظہر ہیں انہیں پیش نظر رکھ کر مقصودِ حقیقی کا تصور کیا جانے لگا۔ اور تصوف میں یہ نظریہ جڑ پکڑ گیا کہ جب تک انسان حسنِ مجاز سے دل نہ لگائے۔ اسے حسنِ حقیقی کی قدر و منزلت معلوم نہیں ہو سکتی۔

عشق مجازی کو عشق حقیقی کا ذریعہ اس معنی میں کہا گیا ہے کہ جب معشوقِ مجازی کا عشق درجہ کمال کو پہنچتا ہے تو ہر وقت اور ہر جگہ معشوق ہی نظر آتا ہے۔ اس عشق سے سالک پر جو بے خودی طاری ہوتی ہے اس میں وہ اپنی

ذات اور جملہ کائنات کو فراموش کر دیتا ہے اور معشوق ہی کو عالم شہادت میں دیکھتا اور موجود پاتا ہے۔ اس عشق میں کمال حاصل ہونے کے بعد پھر وہ معشوقِ حقیقی کی طرف رجوع کرتا ہے جو اللہ تعالیٰ کی ذات ہے۔ اور دنیا وما فیہا کو فراموش کر کے اس کے جمال و کمال کی طرف متوجہ ہوتا ہے اور اس رابطے سے جو بیخودی یا لٹی خودی کی حالت طاری ہوتی ہے اس میں سوائے اللہ کی ذات کے کسی اور کا تصور باقی نہیں رہتا۔ اپنی ہستی اور خودی کا خیال قطعاً محو ہو جاتا ہے اور یہ سمجھتا ہے کہ میں موجود نہیں ہوں۔ صرف اللہ کی ذات ہی موجود ہے اور اس میں جذب اور فنا ہو چکا ہوں۔ لہذا جب صوفی کسی مجازی حسن کی تعریف کرتا ہے تو حقیقت میں اس کے پیش نظر حسن مطلق کی ذات ہوتی ہے۔ میر تقی میر نے کیا خوب کہا ہے۔

صورت پرست ہوتے نہیں معنی آشنا

ہے عشق سے بتوں کے مرا مدعا کچھ اور

خواجہ صاحب کے ہاں عشق کی جو واردات ملتی ہیں ان پر یہ شعر ہو بہو صادق آتا ہے۔ ان کا عشق اگرچہ بظاہر کسی گوشت پوست والے انسان سے متعلق معلوم ہوتا ہے۔ اور اس میں کوئی شک بھی نہیں کہ اس عشق مجازی سے ان کی ذات مبرا نہ تھی۔ لیکن چونکہ ان کا مقصود نظر عشق حقیقی تھا اس لئے ان کے عشق میں وہ سوقیانہ رنگ نہیں جو عام طور پر مجازی عاشقوں کا طرۂ امتیاز ہوتا ہے۔ وہ طبعاً شریف اور نیک دل واقع ہوئے تھے۔ عشق کی آگ نے باقی برائیوں کو بھی جلا کر رکھ دیا۔ اور ان میں وہ

صفات پیدا کر دیں جو حقیقی معنی میں ایسے صوفیا کا خاصہ ہیں جنہیں ہر دو عالم میں خدا کے سوا اور کوئی نظر نہیں آتا۔ مولانا روم نے ایسے ہی عاشقانِ پاکباز کے لیے کہا ہے۔

ہر کہ را جامہ ز عشقی چاک شد	او ز حرص و عیب کلّی پاک شد
شاد باد اے عشق خوش سودائے ما	اے طبیب جملہ علت ہائے ما
اے دوائے نخوت و ناموس ما	اے ز افلاطون و جالینوس ما
جسم خاکی ز عشق بر افلاک شد	کوہ در رقص آمد و چالاک شد

فی الحقیقت خواجہ صاحب کا ضمیر تجلیات الٰہی کے انوار سے اٹھایا گیا تھا اور روحانی تربیت نے لطافتِ وحدت اور اوصافِ قدسی کو ان کے دل میں سمانے کی ایسی صلاحیت پیدا کر دی تھی کہ وہ مجسم اس شعر کی تفسیر بن گئے تھے۔

طاف الهوىٰ في بلاد الله كلهم	حتىٰ اذا مرّ بي من بينهم وقفاء

ترجمہ:۔ عشق تمام دنیا میں چکر کھاتا پھر رہا تھا۔ لیکن جب میرے پاس آیا تو ڈیرے ڈال دیے

مشہور فلسفی پلوطینوس فلسفۂ جمال کے سلسلہ میں لکھتا ہے۔

"صرف تین قسم کے آدمی مثل اعلیٰ (ظاہری و باطنی کمالات) تک پہنچ سکتے ہیں۔ موسیقی جاننے والا۔ عاشق اور فلاسفر"

خواجہ صاحب میں یہ تینوں صفات بدرجۂ کمال موجود تھیں۔ لیکن عشق ان کا دین و مذہب تھا سب پر محیط تھا۔ موسیقی کی لے میں بھی انہیں انوار الٰہی کی تلاش رہتی تھی اور فلسفے میں بھی ان کا سارا فلسفہ یہ تھا کہ

کہ عشق کرو اور خود کو مقصودِ حقیقی کی تلاش میں گم کر دو

اس نظریۂ عشق نے انہیں سراپا عشق بنا دیا تھا۔ وہ ہر شے میں حُسنِ ازل کی تجلی دیکھتے تھے۔ شجر، حجر، انسان، حیوان۔ زمین، آسمان سب میں ان کے لئے سامانِ نظر موجود تھا۔ وہ غنچہ د گل سے بھی اپنا دِل بہلاتے اور خس و خاشاک اور کانٹوں میں بھی رعنائی جمال کا مشاہدہ کرتے تھے۔ ان کی کافی کا ایک بند ملاحظہ ہو۔

کتھ پھل گل باغ بہار ڈٹھم ۔ کتھ بلبل زار نزار ڈٹھم
کتھ خس خاشاک تے خار ڈٹھم ۔ ہک نور دے سبھ اطوار ڈٹھم

ترجمہ :۔ باغ و بہار ہوں یا گل و غنچہ سب میں اسی کی قدرت نظر آتی ہے بلبل جو اپنے پیدا کرنے والے کی تعریف کے نغمے سناتی ہے اسی کے راگ الاپتی ہے گل ہوں یا خس و خاشاک اور کانٹے سب میں ایک ہی نور ہے اور اسی کے مختلف اطوار اور طریقے ہیں (تجلیات اور کرنیں ہیں)

خواجہ صاحب کی کافی کا یہ بند فلسفۂ وحدت وجود کا آئینہ دار ہے اور یہی وہ فلسفہ ہے جسے ان کی مجازی رنگ کی شاعری کی روح قرار دیا جا سکتا ہے۔ جب وہ زلف اور رخسار اور زلف و ابرو یا کسی سانولے سلونے محبوب کے عشوہ و ناز کا ذکر کرتے ہیں تو اس سے اُن کی مراد محبوب حقیقی ہوتا ہے۔ جسے جذبۂ عشق سے مغلوب ہو کر وہ مجازی محبوب کے پردے میں مخاطب کرتے ہیں۔ اس طرزِ بیان میں خواجہ صاحب نے ایسا کمال پیدا کیا ہے کہ ان کی شاعری کا یہ حصہ خالصتہً مجاز میں ڈوبا ہوا

معلوم ہوتا ہے۔ خاص طور پر جب وہ مقامی روایات۔ دیہات کے مشہور رومانی کردار اور عوام کی مانوس مرغوب تشبیہات اور استعارات سے کام لیتے ہیں تو وہ عوامی شاعری کے بلند مرتبہ پر پہنچنے کے ساتھ ساتھ رومانی شعراء کی صف میں بھی ایک ممتاز مقام کے مالک نظر آتے ہیں۔

"سوہنی" کی زبانی عشق کی کیفیت ملاحظہ ہو۔

رل ماہینوال رل ماہینوال — ہر دل میں ہے تیڈری بھال

ترجمہ:۔ اے (محبوب) مہینوال۔ ہر دل میں تجھ سے ملنے کا اشتیاق ہے۔ آ ملاقات کر جا اور زیادہ انتظار نہ کرا۔

اگر مہینوال سے مراد محبوب مجازی ہوتا تو ایک عاشق کی زبانی یہ نہ کہلایا جاتا کہ ہر دل میں تجھے ملنے کا اشتیاق ہے۔ کیونکہ یہ جذبہ عشق مجازی کے خلاف ہے۔ اس کے برعکس چونکہ ہر دلعزیزی محبوب حقیقی کی خاص صفت ہے۔ اس لئے محبوب حقیقی کا شیدا بلا تکلف یہ اعلان کر دیتا ہے کہ میں بھی اوروں کی طرح تیری ملاقات کا اشتیاق رکھتا ہوں۔ کبھی مجھے بھی آکر اپنے دیدار سے نواز جا۔

عشق کسی انسان سے ہو' یا ذات حق سے اس میں دل پر خاص قسم کی کیفیات کا مرتب ہونا ضروری ہوتا ہے۔ یہ کیفیات کبھی درد و الم کی صورت میں ظاہر ہوتی ہیں۔ اور کبھی مسرت و شادمانی کا پیام لاتی ہیں درد والم کی کیفیت اس وقت نمایاں ہوتی ہے جب قرب دوست میں دشواریوں کا سامنا ہو۔ لیکن جب ان دشواریوں سے گذر کر عاشق اپنے

مطلوب کو پا لیتا ہے تو اس پر مسرت و شادمانی کا کیف طاری ہو جاتا ہے
یہ واردات قلب عموماً عشق مجازی کی صورت میں زیادہ آن بان سے ظاہر
ہوتی ہیں۔ چنانچہ اردو شعراء میں بھی جنہوں نے مجازی عشق کو اپنا موضوع
سخن بنایا۔ ان کا مرتبہ محاکاتی شاعری میں حقیقی رنگِ عشق کے جویا شاعروں
سے زیادہ بلند ہے۔ مثال کے طور پر خواجہ میر درد کا کلام صوفیانہ شاعری
میں نہایت اعلیٰ مقام رکھنے کے باوجود میر تقی میر کے عشقیہ کلام سے لگا نہیں
کھاتا۔ خواجہ غلام فرید اس بات میں بھی منفرد حیثیت کے مالک ہیں جنہوں
نے عشق حقیقی کو مجاز کا رنگ دے کر اپنی مجازی شاعری میں ایسا سوز و گداز
پیدا کر دیا ہے کہ اس کی مثال مشکل ہی سے کسی اور جگہ مل سکے گی۔

سوہنی کا مہینوال کے عشق میں بیتاب ہونا ملاحظہ ہو۔ یہ پیش نظر ہے
کہ سوہنی اور مہینوال استعاراتی عاشق و معشوق ہیں۔

روز ازل دی سختی ماری ڈتڑی مول نہ قسمت واری

ماپیو ویر نہ ہم سنبھال

ترجمہ:۔ مجھے محبوب کا وصال نصیب نہ ہوا۔ نہ قسمت نے یاوری کی۔ میری
خستہ حالی پر ماں باپ اور بھائی بھی مجھے سہارا نہیں دیتے۔

سوہنی مہینوال کی مشہور داستانِ محبت کے پس منظر میں عاشق کی
حرماں نصیبی کی داستان سنیے

زور ے تو ڑے حسن دے مانڑے سارے ہار سنگار ڈھاہنڑے

آئی اوڑک ٹولاں جال

ترجمہ:۔ اپنی جوانی۔ زور اور حکومت کا غرور اور تمام ہار سنگار عشق نے بھلا دیئے۔ اب تو درد و مصائب کا ساتھ ہے۔

جس طرح سوہنی کو جرمِ عشق کی پاداش میں عزیز و اقارب کی مخالفت اور اپنوں بیگانوں کی ایذا رسانیاں میسر آئی تھیں وہی مشکلات عاشق حقیقی کی راہ میں بھی حائل ہیں۔

خویش قبیلہ دشمن سارا ہر کوئی مارم جانڑ و چارا
برہوں اویڑا اولٹی چال

ترجمہ:۔ محبت کی بھی عجیب الٹی چالیں ہیں۔ تمام عزیز و اقربا دشمن ہو گئے ہیں اور عاشق کو بے چارہ جان کر سب مارتے اور تکلیف دیتے ہیں۔

چشم کافر کی فسوں سازی ہو یا سیاہ زلفوں کی ادائے دلگیر، عاشق صادق ان میں بھی اپنے دردِ دل کا درماں تلاش کر لیتا ہے دیکھئے خواجہ صاحب ایک بتِ طناز کا سراپا کس طرح کھینچتے ہیں۔

کافی کا پہلا شعر ہے

ہیں تاں تیکوں منتاں کردی ساول اسانوں سنبھال

ترجمہ:۔ اے سانولے محبوب میں تیری منت کرتی ہوں کہ کبھی میری طرف بھی نگاہ لطف کر۔

اب اگلے شعر پڑھیئے۔

وہ غمزے وہ ناز چھولے وہ نخرے وہ تلک تلولے
وہ زلفاں وہ خال

ترجمہ:۔ سبحان اللہ! محبوب کے ناز۔ نخرے۔ خوش کلامیاں۔ بناؤ سنگار۔
تلک تمولے۔ اور گیسو تل کی آرائش سب قابل تعریف ہے۔

کتی کر دام دلیں توں ونگن   کتی کر ناگ جگر نوں ڈنگن
عطروں بھنڑے وال

ترجمہ:۔ عطر میں بسی ہوئی زلفیں کبھی جال بن کر دلوں کو جکڑتی ہیں۔ اور
کبھی سانپ بن کر جگر کو ڈستی ہیں

جس بتِ طناز کا یہ سراپا آپ نے سُنا۔ اب اسی کے ہجر کا قصہ بھی
سنتے چلیئے اور اندازہ لگائیے کہ یہ سوزِ ہجر کبھی کسی کو عشق حقیقی میں بھی
میسر آیا ہے۔

جیں ڈینہہ یار اساں توں روٹھرے   بٹھ پئے ڈوریئے ململ پھٹرے
جر جر جر بو گھرتے آل

ترجمہ:۔ جب سے محبوب ہم سے روٹھ گیا ہے۔ ململ اور ڈوریئے کے کپڑے ہم نے پھاڑ ڈالے ہیں
کہتے ہیں۔ مصیبت کے دن پہاڑ معلوم ہوتے ہیں۔ کاٹے نہیں کٹتے
ایک ایک دن کئی کئی سال کے برابر محسوس ہوتا ہے یہی کیفیت اس
بند میں پیش کی گئی ہے۔

اتنا ظلم مناسب ناہیں   رو رو پٹ پٹ کر کر دہائیں
گذر گیئے سے سال

ترجمہ:۔ اے محبوب اتنا ظلم مناسب نہیں ہے۔ روتے پیٹتے فریاد وزاری
کرتے کرتے سینکڑوں سال گذر گئے ہیں۔

خواجہ صاحب کے دیوان میں ایسی متعدد کافیاں ہیں جن میں انہوں نے ریگستانی مناظر اور وہاں کی رہنے والی دوشیزاؤں کے حسن دلفریب کا بڑے فنکارانہ انداز میں نقشہ کھینچا ہے۔ خاص طور پر ان کی یہ کافیاں

وچ روہی دے رہندیاں　　نازک نازو جٹیاں

اور

آچنوں رل یار　　پیلوں پکیاں نی وے

منظر کشی حسنِ ادا اور دلسوزی کی بہترین مثال ہیں۔ انہیں پڑھ کر کسے یہ یقین آسکتا ہے کہ وہ فی الواقعہ محبوب حقیقی کے تصور میں انسانی جمال وجلال سے لطف اندوز ہو رہے ہیں۔ لیکن حقیقت یہی ہے کہ اشیائے مجاز سے وہ حقیقت کا ادراک کرتے ہیں۔ مثال کے طور پر موخر الذکر کافی میں ریگستان سے صحرائے عرب مراد لی ہے اور پیلو کے پھل سے ثمر اسلام کی تلمیحات کو نبھایا ہے۔

مجازی حسن جمادات۔ نباتات۔ حیوانات اور انسان سے تعبیر کیا جاتا ہے اور عاشقانِ کامل کے نزدیک ان سب چیزوں میں حسنِ مطلق کا نظارہ کرنا واجب و ضروری ہے۔ صرف یہی نہیں بلکہ حسنِ مطلق جب انسانی جسم میں جلوہ نما ہوتا ہے تو اس کے نظارے پر ہی اکتفا نہیں کیا جاتا بلکہ اس سے عشق کی پینگیں بڑھائی جاتی ہیں۔ ولی نے کیا خوب کہا ہے۔

حسن تھا پردۂ تجرید میں سب سے آزاد
طالبِ عشق ہوا پیکرِ انسان میں آ

جب حسنِ مجرد پیکرِ انسان میں آکر عشق کا طالب ہو تو کون ایسا عاشق ہوگا جو اس تقاضے کو پورا نہ کرے۔ چنانچہ خواجہ صاحب نے اس تقاضے کو پورا کرکے اپنے عاشقِ صادق ہونے کا ثبوت دیا ہے۔

ان کی ایک کافی کا یہ بند بقول صاحبِ "گوہر شب چراغ" اسی مجازی عشق کی غمازی کرتا ہے۔

گل زلف پنل دا پیچ پیوم — ہتھ ہوت دے دلڑی وِنج ڈِتم
سٹ سیجھ فرید بعید تھیوم — ویساں کیچ نہ رہساں جاتے میں

ترجمہ:۔ اے فرید! محبوب سے دُور ہو کر میں نے سیج ترک کردی ہے اور گلے میں گیسوئے محبوب کا پیچ پڑا ہوا ہے۔ ہوت محبوب کے ہاتھ میں نے دل بیچ دیا ہے اب تو ضرور کیچ (وطنِ محبوب) کی طرف چلی جاؤں گی اور اپنے مسکن پر ہرگز نہ رہوں گی۔

ذیل کی کافی بھی اس سوزِ عشق کا نتیجہ معلوم ہوتی ہے۔

مارو محب ملیر سدھایا — ولدا کوئی پیغام نہ آیا
بھردی شہر آواری بھلّو

ترجمہ:۔ محبوب تھگر ملیر چلا گیا ہے۔ جس کا کوئی پیغام بھی نہیں آیا۔ اور میں فراق زدہ عاشق شہر میں آوارہ پھر رہی ہوں۔

عشق فرید نہ کیتم بھلا — ہے ہے بخت نہ تھیوم سوّلا
وبندم ہوت دساری بھلّو

ترجمہ:۔ اے فرید عشق نے میرے ساتھ کوئی بھلائی نہیں کی۔ افسوس کہ بخت نے بھی

یاوری نہ کی اور محبوب (ہوت) مجھے فراموش کر کے جا رہا ہے۔

ان شعروں میں انتظار دوست کی وہی کیفیت پیش کی گئی ہے جو عام طور پر مجازی عشق کا نتیجہ ہوتی ہے۔

اج مانگھ مہینے دی ناویں وے ۔۔۔ ول آویں آ گل لاویں وے

ترجمہ:- اے محبوب تیرے انتظار میں آج مانگھ کے مہینے کی نو تاریخ بھی آگئی ہے اب تو واپس آکر مجھے گلے لگا۔

رت رنگیلی تے ساعت سوہنی ۔۔۔ موسم گل پھل دی من موہنی
مد مستانی دو گھڑیں کوہنی ۔۔۔ سانول صحن سہاویں وے

ترجمہ:- اے سانولے محبوب اب تو رنگین موسم اور حسین گھڑیاں ہیں۔ پھولوں اور پھلوں سے دل کو لبھانے والا سماں چھا گیا ہے۔ ایسے کیف آور وقت میں درد و غم مٹ جایا کرتے ہیں۔ اے محبوب میرے صحن خانہ کو آکر رونق بخش۔

الغرض خواجہ صاحب کے مشاہدۂ جمال کا یہ سلسلہ جمال مطلق کی رسائی تک پہنچتا ہے اور وہ نیرنگیٔ مجاز سے حقیقت کا پوری طرح ادراک کر لیتے ہیں۔ ذیل کی کافی ان کے مجازی رنگ کی قلعی کھول دینے کے لئے کافی ہے۔

بٹھ گھت کوڑ نکمڑے ۔۔۔ ہک حق کوں کر یاد

ترجمہ:- جھوٹے اور بیکار خیالوں کو چھوڑ دے۔ صرف خدا تعالیٰ (حق) کو یاد کر۔

ھتی کر گھلا رت پوں تے ۔۔۔ کر دیں دہانہہ فریاد

ترجمہ:- خون اور پیپ (انسان) پر دیوانہ ہوکر آہ و فریاد کرتا ہے۔

باجھوں احد حقیقی ۔۔۔ محض خراب آباد

ترجمہ:۔ ذات پاک واحد کی محبت کے بغیر تمام عالم ایک ویرانے اور خرابے کے مانند ہے۔

حسن مجازی کوڑا ہے فانی برباد

ترجمہ:۔ مجازی حسن جھوٹا فانی اور برباد ہونے والا ہے۔

کل شے غیر خدادی ہالک بے بنیاد

ترجمہ:۔ خدا تعالیٰ کی ذات کے سوا دُنیا کی تمام چیزیں بے بنیاد اور فنا ہونے والی ہیں۔

باجھ محبت ذاتی کوجھا شور فساد

ترجمہ:۔ ذات باری کی محبت کے سوا تمام شور و فساد بدنما اور غیر مفید ہے

خواجہ صاحب کے کلام میں یاس و رجائیت کی ہم آہنگی

تصوف کی تعلیم قنوطیت کے بالکل خلاف ہے۔ اس میں تزکیہ نفس اور تسلیم و رضا کا جو تصور پیش کیا گیا ہے اس کا مقصد یہی ہے کہ انسان خدا کی رحمتوں سے مایوس نہ ہو اور تلاش حق میں جن آلام و مصائب کا سامنا ہو انہیں ہنسی خوشی برداشت کرے۔

اس فلسفے سے خواجہ صاحب کا متاثر ہونا یقینی تھا۔ ویسے بھی قدرت نے انہیں مال و دولت کی فراوانی۔ عزت و آبرو اور ساز گار ماحول عطا کیا تھا جس کی وجہ سے قنوطیت کے وہ اسباب جو عموماً غیر مطمئن زندگی اور ناموافق حالات کی پیداوار ہوتے ہیں۔ ان کے ہاں مفقود رہے۔ بچپن سے جوانی اور جوانی سے بڑھاپے تک عقیدتمندوں اور پرستاروں کے جھرمٹ میں رہنے کے بعد یہ کیسے ممکن تھا کہ کوئی آزار ان کو چھو بھی جاتا۔ لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ ان کی زندگی رجائیت کے ان ہمہ گیر عناصر کے باوجود یاس و قنوط سے لبریز ہے۔ اور یہ قنوطیت محض اتفاقی یا حادثاتی طور پر کسی ایک آدھ جگہ ظاہر نہیں ہوتی بلکہ اس کی ایک مستقل حیثیت ہے جس کا خواجہ صاحب کی زندگی سے بڑا گہرا تعلق معلوم ہوتا ہے۔

اگر طبیعت کی اس غم پسندی کے اسباب خواجہ صاحب کی زندگی کے حالات میں تلاش کیے جائیں تو دو باتیں خصوصیت کے ساتھ سامنے آتی ہیں۔ ایک ان کے رومان کا وہ قصہ جو روہی کی کسی دوشیزہ سے متعلق بنایا جاتا ہے اور جس کے کارن یہ مشہور ہے کہ خواجہ صاحبؒ وہی جیسے بے آب و گیاہ ریگستان میں اٹھارہ سال ڈیرے ڈالے پڑے رہے۔ یہ بات جیسا کہ مقامی روایات سے واضح ہے اگر حقیقت پر مبنی قرار دی جائے تو خواجہ صاحب کا رنج و غم اور مصیبت سے دوچار ہونا سمجھ میں آجاتا ہے۔ ظاہر ہے جو شخص اٹھارہ سال ہجر کے صدمے سہتا رہے وہ یاس و قنوط کے جذبات سے کیسے یکسر آزاد ہو سکتا ہے

دوسری بات نظریاتی قسم کی ہے خواجہ صاحب کو جہاں تصوف کے مکتب میں تسلیم و رضا اور " لا تئییس من روح اللہ الا الکافرون" کا سبق پڑھایا گیا تھا۔ وہاں سلوک کی منازل طے کرنے کے لئے عشق کی راہ بھی دکھائی گئی تھی۔ یہ راہ خار دار بھی ہے اور ناہموار بھی۔ اسے جرأت اور عزیمت کے بغیر طے نہیں کیا جا سکتا۔

دھمکی میں مر گیا جو نہ باب نبرد تھا
عشق نبرد پیشہ طلبگارِ مرد

خواجہ صاحب نے جب اس عشق نبرد پیشہ کو اختیار کر کے مردانگی کا ثبوت دیا تو اس کے متعلقہ جملہ آلام و مصائب بھی برداشت کیے۔ ہجر و فراق کی تکلیفیں۔ اپنوں بیگانوں کے طعنے۔ انتظار یار کی صبر آزما اذیت

غرض وہ کونسی مصیبت ہے جو عشق کی بدولت ایک عاشق کو حاصل نہیں ہوتی۔ چونکہ سالکانِ راہِ طریقت عاشق صادق ہوتے ہیں۔ اس لیے وہ اس راستے کے تمام خطرات کا خندہ پیشانی سے مقابلہ کرتے ہیں۔ جہاں تک تکالیف کے اظہار کا تعلق ہے یہ اگرچہ ایک طبعی امر ہے اور ہر ذی روح کا اس کے احساس سے مضطرب و بیقرار ہونا قدرتی بات ہے لیکن صوفیا اس کے اظہار کو مناسب نہیں سمجھتے یا پھر مسلسل ریاضت کے بعد اپنے آپ کو فنا فی الذات کے ایسے سانچے میں ڈھال لیتے ہیں جس میں رنج و غم کا احساس باقی نہیں رہتا۔ اس کے علاوہ ایک طبقہ ایسے غم پسندوں کا ہوتا ہے جنہیں تکلیف اور اذیت میں مزا آتا ہے اور وہ ہر غم و اندوہ کو من جانب اللہ سمجھکر اپنے سینے سے لگاتے ہیں۔ یہ فنا فی العشق کا مقام ہے اور بغیر وجد و حال کے حاصل نہیں ہو سکتا۔

پار اترا وہ جو غرق ہوا بحرِ عشق میں
وہ داغ ہے جو دامنِ ساحل میں رہ گیا

خواجہ صاحب کا شمار عشاق کے اسی زمرے میں ہوتا ہے۔ لیکن وہ غریقِ بحرِ عشق ہونے کے باوجود آسودۂ ساحل نظر آتے ہیں۔ انہیں عشق کی دشواریاں پیش ضرور آتی ہیں لیکن ایسا نہیں ہوتا کہ وہ ان دشواریوں سے ڈر کر ترکِ عشق کی ٹھان لیں۔ انہوں نے نہ صرف عشق کی دشواریوں کو گوارا کیا بلکہ یہ امید بھی رکھی کہ بالآخر ان کی منزل آسان ہوگی۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے کلام میں قنوطیت اور رجائیت کے اثرات ایک ساتھ نظر آتے ہیں۔ ان کی وہ کاوشیں جو انتہائی درد و غم میں ڈوبی ہوئی ہیں اور جنہیں پڑھکر یہ خیال گذرتا ہے کہ خواجہ صاحب

قنوطی شاعر ہیں۔ اگر انہیں کو بالاستیعاب دیکھا جائے تو یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ وہ اپنے قاری کو رنج وغم کا محض ایک تاثر دینا چاہتے ہیں ورنہ اس سے ان کا منشا کسی کو غمگین کرنا نہیں کیونکہ انہیں کافیوں میں دو ایک شعر۔ وہ ایسے بھی کہہ جاتے ہیں جو غمگین طبیعتوں کو امید و رجا کی طرف متوجہ کر دیتے ہیں

خواجہ صاحب کی قنوطی شاعری کا یہ رجائی پہلو بڑا تابناک ہے

چند نمونے ملاحظہ ہوں۔

درد پیٔے دل پیٹے ڈتڑے یار رنجھیٹے
میں بیٹھیں گئی عمر نہ آئے لانویں لہن دے سیٹے
ہتھڑیں پیریں غم دے گانے سر سولاندے ریٹے
سینگیں سرتیں مُکڑے جھیڑے ککڑیں سو رہیں پھیٹے
سانول آوے آگل لاوے سبھوں پیچھیں لیٹے
دلڑے سو سو زخم کللڑے سینے سخت پچیٹے

یار فرید سنبھالم جیندیں
رب ڈکھ ڈکھڑے میٹے

اس کافی میں خواجہ صاحب درد فراق کا بیان کر رہے ہیں۔ کہتے ہیں کہ " درد پھر ہمارے حصے میں آ گیا ہے۔ جو رانجھا دوست کا دیا ہوا ہے مجھے مائیوں بیٹھے ہوئے عمر گذر گئی لیکن وہ شادی کی آخری رسوم کی ادائیگی کے وقت تک نہ آیا۔ اب تو ہاتھوں اور پیروں میں غم کے تاگے اور سر پہ

ماتمی چادر ہے۔ سہیلیاں۔ رشتہ دار اور سسرال والے سب دشمن ہو گئے ہیں۔ کاش میرا دوست آ کر مجھے گلے لگائے اور خوشی سے بستر عروسی پر لیٹ جائے۔ دل میں سینکڑوں زخم اور سینے پر سخت ضربات ہیں۔ اے فرید میرا دوست مجھے جیتے جی سنبھالے اور خدا میرے دکھوں کو مٹائے۔"

ایک اور کافی ہے۔

وسیوں سنجھ صباحیں | خالی رہسن جائیں
پکھی پردیسی ابھے سردے | دو دن دے خلقائیں
ملک بیگانہ دیس پرایا | کوجھیاں کوڑ بنائیں
نا کوئی ساتھی نا کوئی سنگتی | کینوں درد سنائیں
قسمت سانگے ڈٹھم اے دھرتی | آندا کون اتھائیں
حسن نگر ڈوں تھیوم روانہ | یارب توڑ پچائیں
منگاں دعائیں اللہ سائیں | وچھڑیا ڈھول ملائیں

عشق فرید ہوں ڈوکھ ڈتڑے
بچھیاں برہوں بلائیں

اس کافی میں دنیائے فانی کا نقشہ کھینچکر اس سے بیزاری کا اظہار مطلوب ہے۔ چنانچہ کہتے ہیں۔

"شام یا صبح کو ہم یہاں سے کوچ کر جائیں گے اور یہ مسکن اور بستیاں خالی رہ جائیں گی۔ ہم پردیسی پرندے دو دن کے لئے اخلاق کا رونا روتے ہیں۔ پرایا دیس ہے اور بیگانہ ملک ہے اور اس کی تمام عمارتیں

خراب اور جھوٹی ہیں نہ کوئی ہمراہ آیا ہے اور نہ کوئی ساتھ جائے گا۔
کس کو محرم راز بنائیں اور درد کی داستان سنائیں بد قسمتی سے اس
سرزمین کو دیکھنا پڑا۔ ورنہ کس کو پڑی تھی کہ اس فانی اور بے رونق
دنیا میں قدم رکھتا۔ اب تو میں حسن نگر کیلئے روانہ ہو رہا ہوں۔
اے خدا تو ہی منزل تک پہنچائے گا۔ یا الٰہی! میری یہ ہر وقت دعا
ہے کہ بچھڑا ہوا دوست مجھے آملے۔ اے فرید! عشق نے بہت تکلیفیں
دی ہیں۔ محبت کی بلائیں ہر وقت میرا تعاقب کرتی ہیں"

ان دونوں کافیوں میں رنج و الم اور یاس کے اثرات ملتے ہیں لیکن
ان کے بین السطور امید و رجا بھی جھلکیاں مارتے دکھائی دیتے ہیں۔
مثال کے طور پر موخرالذکر کافی ہیں جہاں دنیا کی بے ثباتی اور دنیاوی تعلقات
کی ناستواری کا یاس انگیز منظر سامنے آتا ہے۔ وہاں حسن نگر کے ذکر سے یکایک
سوکھے دھانوں میں پانی پڑ جاتا ہے اور دلوں میں دیدار دوست کی نئے سرے
سے اُمنگ پیدا ہو جاتی ہے۔

فی الحقیقت خواجہ صاحب اپنے میلان طبع کے اعتبار سے رجائی تھے۔ جس
کا اظہار انہوں نے نت نئے انداز میں کیا ہے۔ خاص طور پر برکھا رت اور
مناظر قدرت کے موضوعات پر ان کی نظمیں بہاریہ شاعری کی جان ہیں۔ لیکن
چونکہ وہ عوام کے ترجمان تھے اس لئے ان کی کافیوں میں عوامی زندگی کی صحیح تصویر
بھی ملتی ہے عوامی زندگی بھی شہری یا خوشحال معاشرے کی عکاس نہیں تھی بلکہ
اس کا تعلق اس ریگستان سے تھا جہاں کے لوگ بارہ مہینے پانی کے لئے ترستے

ہیں۔ اور جہاں زندگی آسائشوں اور راحتوں سے محرومی کا نام ہے۔

ماحول کی اس دردانگیزی میں خواجہ صاحب کے سوز دروں کی شمولیت سے زندگی کا سرتاپا آہ و بکا بن جانا غیر یقینی نہ تھا۔ چنانچہ غم واندوہ کی یہ دو آتشہ شراب ان کے شعروں کے جام میں چھلکتی نظر آتی ہے وہ اسی واقعاتی پس منظر کا نتیجہ ہے۔ دیکھئے ذیل کے شعر کس قدر درد و کرب کے حامل ہیں۔

سینڈھیاں کچڑیاں مینڈیاں پھکڑیاں   کجلے اجڑے سرخیاں بکھڑیاں
یاساں ملیاں آساں نکھڑیاں   لوں لوں وین دلیندی ہے

ترجمہ:۔ ہجر میں تمام اسباب آسائش بیکار ہو گئے ہیں۔ مانگ بگڑ گئی ہے۔ مہندی کا رنگ پھیکا پڑ گیا ہے۔ کاجل اجڑ گیا ہے۔ ناامیدیوں کا زور ہے۔ امیدیں قطع ہو گئیں اور بدن کا رواں رواں مصروفِ نوحہ و غم ہے۔

تول تہالیاں دار ڈسیجن   ہار پھلاندے خار ڈسیجن
صحن حویلیاں بار ڈسیجن   سب شئے موجھ ودھیندی ہے

ترجمہ:۔ نرم بستر سولی معلوم ہوتا ہے۔ پھولوں کے ہار خار نظر آتے ہیں۔ گھر کے صحن اور حویلیاں، جنگل اور سنسان ویرانے نظر آتے ہیں۔ ہر چیز ملال آفریں اور درد افزا ہے

حافظ شیرازی کا مشہور شعر ہے۔

شب تاریک و بیم موج گردابے چنیں حائل
کجا دانند حالِ ما سبکسارانِ ساحل ہا

اسی مضمون کو خواجہ صاحب نے اپنے مقامی حالات کے مطابق اس طرح باندھا ہے

نا تو لہہ ٹانگ سنداری   ہیں من تاری تے نیں باری
مینہہ پوری رات اندھاری   بیا خاص مینہہ پوہے

ترجمہ:۔ بے سروسامانی کی یہ حالت ہے کہ نہ میرے پاس بحرِ عشق کو عبور کرنے کے لیے توہہ سنداری (دریا میں تیرنے میں مدد دینے والی اشیاء) ہے نہ دوسری طرف کوئی نشان منزل دکھائی دیتا ہے۔ پھر اس گہری ندی میں مجھے تیرنا بھی نہیں آتا۔ بارش کا زور۔ رات کی تاریکی اور اس پر پوس کے مہینے کی سخت سردی۔

کونج پرندوں میں بڑا وفادار عاشق مشہور ہے کہتے ہیں کہ وہ اپنی ٹولی سے کسی حالت میں جدا نہیں ہوتا۔ لیکن اگر کبھی وہ اپنے ساتھیوں سے بچھڑ جائے تو کراہ کراہ کر مر جاتا ہے۔ خواجہ صاحب نے ذیل کے بند میں اپنی جدائی کی کیفیت کو اس حرماں نصیب پرندے کی بے قراری سے تشبیہ دیکر بیان کیا ہے۔

عشق فرید رلایم بر وچ   ہڈ ہڈ تے انگ انگ یارا
نکھڑیم کونج ولھر دی

ترجمہ:۔ اے فرید عشق نے میرے ہر ہر استخواں اور عضو عضو کو اس طرح جنگل بیابان میں آوارہ رلایا ہے جس طرح اپنی ٹولی سے کونج جدا ہو کر پریشان پھرتی ہے۔

خواجہ صاحب درد وکرب کی یہ کیفیت طرح طرح سے بیان کرتے ہیں۔ لیکن یہ بہرحال خیال رکھتے ہیں کہ کہیں ان کا قاری غم کے سیلاب میں بہہ کر زندگی کی دوسری حقیقتوں سے غافل نہ ہو جائے۔ دراصل وہ ایک ایسے

معاشرہ کی تخلیق کے جویا تھے جس میں نیکی۔ رحم۔ انصاف۔ محبت اور خدا پرستی کا دور دورہ ہو۔ چنانچہ جب وہ آلام روزگار کا ذکر کرتے ہیں تو اس سے ان کا مطلب لوگوں میں یاس و حرماں کے جذبات پیدا کرنا نہیں بلکہ عبرت دلانا مقصود ہوتا ہے۔ ذیل کی تمام کافی اسی حقیقت کی آئینہ دار ہے۔

سٹ سک غیر خدا دی سب شے وہم خیال
کتھ لیلے کتھ مجنوں کتھ سوہنی مہینوال
کتھ رانجھن کتھ کھیڑے کتھ ہے ہیر سیال
کتھ سسی کتھ پنوں کتھ او دردکشال
کتھ سیفل کتھ پریاں کتھ و ہجر وصال
باجھوں احد حقیقی کل شے عین زوال
چار دہاڑے چیز دے کوڑے کبر وال
ما خلد اللہ باطل بے شک کوڑ پپال
یار فرید نہ وسرم
مشکل محض محال

مطلب یہ ہے۔ کہ خدائے واحد کے علاوہ دنیا کے تمام قصے وہم و خیال سے زیادہ حقیقت نہیں رکھتے۔ لیلی مجنوں۔ سوہنی مہینوال۔ ہیر رانجھا۔ سسی پنوں۔ سیف الملوک اور اس کی پریاں اور ان کی محبت کی داستانیں۔ سب باطل اور فنا ہونے والی ہیں۔ صرف خدائے واحد کی ذات کو بقا ہے۔ فصل بہاری پر ناز بھی فضول ہے کیونکہ اس کی مدت بھی چار دن سے زیادہ نہیں۔ خدا کی ذات کے

علاوہ ہر چیز باطل اور ناقابل اعتبار ہے اے فرید بس وہی ایک ذات ہے جو کبھی فراموش نہیں ہو سکتی۔

خواجہ صاحب اس عبرت انگیز وعظ و نصیحت کے علاوہ دل کے غم کوش گوشوں کے لئے راحت و شادمانی کا سامان بھی فراہم کرتے ہیں لیکن اس میں بھی ان کا اصل مطمحِ نظر قائم رہتا ہے اور وہ بڑے فنکارانہ انداز میں یہ تاثر چھوڑ جاتے ہیں کہ انسان خوشی سے بھول کر اپنی حقیقت کو نہ بھول بیٹھے۔ چنانچہ جہاں وہ یہ کہتے ہیں کہ ہر طرف بادِ بہاری نے عیش و راحت کی فضا پیدا کر دی ہے وہاں یہ بھی بتا دیتے ہیں کہ یہ سب کچھ خدا کی مہربانی سے ہوا ہے۔ ایک کافی کے چند شعر ملاحظہ ہوں۔

سگھی کر لیو ہار سنگار سبھی — سیاں رل مل دھوم مچائی

گرجت بدرہ لسکت بجلی — رت ساون ٹھیک سہائی

اٹن پپیہے کرن پلارے — رس کوئل کوک سنائی

ترجمہ:۔ اے ہمجولیو ہار سنگار کر کے بن سنور جاؤ سب سہیلیاں مل جل کر خوشیاں منا رہی ہیں۔ بادل گرج رہے ہیں۔ بجلی کوند رہی ہے۔ ساون نے موسم کو خوب آراستہ کر دیا ہے اٹن اور پپیہے کیف آور بولیاں بول رہے ہیں اور کوئل رس میں بھری ہوئی کوک سنا رہی ہے۔

واضح رہے کہ جس سرزمین (روہی) کی ترجمانی خواجہ صاحب نے کی ہے وہاں موسم باراں کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔ بارش جو سال میں ۵ انچ سے زیادہ نہیں ہوتی اسی پر یہاں کی آبادی کی معیشت کا دارومدار ہے۔ بارہ مہینے کی

خشک سالی کے بعد جب کبھی یہاں بارش کے چند قطرے ٹپک جاتے ہیں تو لوگ عید کی سی خوشیاں مناتے ہیں

اس غیر معمولی خوشی کے موقعہ پر بھی خواجہ صاحب اپنے مشن سے نہیں چوکتے اور یہ کہہ جاتے ہیں

ملک ملہیر وسایم مولی　　　سب گل پھل خنکی چائی
مد تاں تے پچھے را نجھن ملیا　　　رب اُجڑی جھوک وسائی

یعنی یہ پھولوں پر جو خنکی ہے اور ہر طرف تازگی کے آثار نظر آتے ہیں خدا کی عنایت کا نتیجہ ہے جس نے بارش بھیجی۔ وہی محبوب سے ملاقات کرانے اور گھروں کو آباد کرانے کا ذمہ دار ہے۔

اسی طرح ایک کافی میں جہاں یہ کہتے ہیں کہ فراقِ دوست میں تمام زیورات اتار پھینکے ہیں اور چکوی کی پکار ہرے زخموں پر نمک پاشی کر رہی ہے۔ وہاں یہ بھی فرما دیتے ہیں۔

سمجھ فرید نہ تھی غم واسو　　　اللہ میلیسم ڈھول

ترجمہ:۔ اے فرید غمزدہ نہ ہو اور سمجھ لے کہ اللہ تعالیٰ ضرور وصالِ دوست کے اسباب پیدا کرے گا۔

ایک اور کافی میں دردِ عشق اور فراقِ دوست کی کیفیات بیان کرنے کے بعد اپنے دل کو یوں ڈھارس دیتے ہیں

انگن فرید دے　　　سانول اوسی دے
کرم کریسم آپے　　　تانگھیں آس ودھایم

ترجمہ :- محبوب ضرور کرم کرے گا۔ فرید کے صحن کو مشرف کرے گا۔ انتظار شدید نے یہ امید بندھا دی ہے کہ میرے اس حال زار پر اسے ضرور ایک نہ ایک دن ترس آئے گا۔

جب خدا مہربان ہو تو جنگل اور ریگستان بھی ہرے بھرے نظر آتے ہیں۔ وہ سہیلیاں جو پہلے ہجران زدہ کی حالت زار پر طعنے دیا کرتی تھیں۔ خوشی کے آثار دیکھ کر مبارک باد دینے لگتی ہیں۔ صحرا کے خار و خس پر رعنائی اور دل کشی چھا جاتی ہے اور رنج و غم، خوشی میں تبدیل ہو جاتے ہیں۔ چند شعر ملاحظہ ہوں۔

(۱)

اج رنگ رُخ تے ولیا ہے
مناں ماہی ماہنوں گھلیا ہے

(۲)

جنگل بیلے سبز چائی — رونق رونہ برونہ سوائی
رل مل سیاں ڈیون ودھائی — رانجھن نوں نول رلیا ہے

(۳)

کانہہ کھپلے خنکی چائی — جائی لیاندے پور للائی
گگی پھل کردے حُسن نمائی — سُکھ ملیا ڈکھ ٹلیا ہے

(۴)

ماہی کیتے جھوکیں ڈیرے — تھئیے ہُن میرے بھاگ بھلیرے

ہتھ گانے سر سوہندے سہرے باغ خوشی دا پھلیا ہے

ترجمہ:۔ آج چہرے کا رنگ ترو تازہ معلوم ہوتا ہے۔ شاید محبوب نے کوئی قاصد بھیجا ہے

(۲) جنگل اور بیابان سر سبز ہو گئے ہیں۔ ان کی شادابی روز افزوں ہے۔ سہیلیاں مل جل کر مبارکباد دے رہی ہیں۔ محبوب کا عشق ہر بن مو میں سرایت کر گیا ہے

(۳) صحرائی سرکنڈوں پر خشکی کے آثار نمایاں ہیں اور جھاؤں کے بوٹے سرخ ہو گئے ہیں باغ کے پھول اپنی خوبصورتی کی نمائش کر رہے ہیں۔ آرام مل گیا ہے اور غم ٹل گیا ہے۔

(۴) میرا ماہی یعنی محبوب میرے جھونپڑے میں آ ٹھہرا ہے۔ میرے نصیب کھل گئے ہیں۔ ہاتھوں میں گہنے اور سر پر خوشنما سہرے ہیں۔ خوشی کا باغ بار آور ہو گیا ہے۔

عموماً شعرا غم فراق کا بیان کرتے وقت اپنے محبوب کا شکوہ کرتے ہیں۔ اس کی بے وفائیوں کا رونا روتے ہیں اور اس پر رقیب کی محبت کی تہمت لگا کر اپنا دل ٹھنڈا کرتے ہیں۔ خواجہ صاحب کی رجائیت کا کمال یہ ہے کہ وہ اپنے دوست کو بھی بے وفا نہیں کہتے رہے رقیب اور عدو تو اُن کے تصورات سے ہی ان کی شاعری پاک ہے۔ چنانچہ ایک جگہ کہتے ہیں۔

یار فرید منیندم آکھیے کیا غم بئے دے ویر دا

ترجمہ: اے فرید جب دوست میرا کہنا مان لیتا ہے تو پھر دوسروں کے بیر کا کیا غم۔

دوست کی وفاداری پر اس اعتماد کا سبب بھی سُن لیجیے

حسن ازل دی چال عجیبے طرح لطیفے طرز غریبے

آپ ہی عاشق آپ رقیبے   تھی دلبر جگ موہس سارا

ترجمہ :۔ حسن ازل کی چال عجیب اور لطیف ہے اور طور طریقے انوکھے ہیں۔ وہ خود ہی عاشق اور خود ہی رقیب ہے اور خود ہی دلبر بن کر ساری دنیا کو موہ لیتا ہے۔

یہ اسی حسنِ باوفا سے توقع کی جا سکتی ہے کہ وہ ساری رات عاشق کی بانہہ پر اپنا سر رکھے اس سے ہم آغوش رہے۔

ساتوں بانہہ سراندی دے کر   ساری رات نبھائے

ترجمہ :۔ خدا کرے کہ محبوب میری بانہہ سرہانے دے کر ساری رات یہاں بسر کرے

خواجہ صاحب کی بہاریہ شاعری

خواجہ صاحب کو موسم برشگال سے خاص دلچسپی تھی۔ جہاں بارش کے آثار نمودار ہوئے وہ لبِ دریا پہنچ جاتے تھے اور وہاں پہروں موسم کی کیف باری سے لطف اندوز ہوتے تھے۔ گوہرِ شب چراغ میں لکھا ہے

"ساون آتے ہی دریائی سفر کی ٹھہر جاتی تھی۔ کشتیاں حسب منشا تیار کروا رکھی تھیں۔ بس خور و نوش کا تمام سامان لے کر بہاؤ کی طرف اور کبھی الٹے رخ روانہ ہو پڑتے۔ تیراک غضب کے تھے۔ زیادہ تر پانی میں رہتے۔ شام ہوتی تو کسی "بیٹ" میں فروکش ہو جاتے۔ قرب و جوار کے مرید اگر سن پاتے تو پہلے ہی سے وہاں کھانے پینے کا انتظام کر چھوڑتے۔ نہیں تو بکریاں وغیرہ سب کچھ ہمراہ ہوتا حسب ضرورت ذبح ہو کر وہیں پخت و پز شروع ہو جاتی۔ اللہ اکبر! کیا ہی اچھا سماں ہوگا۔ سطح آب پر چلتی کشتیوں پر کبھی اذانیں گونج گونج کر نمازیں ادا ہو رہی ہوں گی۔ اور کبھی قوالی کی خوش کن تانیں عالم بالا کی خبر لا کر دلِ عشاق کو تڑپا دینے میں ایک نمایاں اثر پیدا کر رہی ہوں گی۔ اس پر اگر کبھی بادل بھی گھر گیا اور بوندا باندی بھی ہونے لگی تو سرمستِ بادۂ عرفان کی دلی مرادیں بر آئیں اور موسم برشگال کا مزا اگر تھا تو درحقیقت انہوں نے ہی لوٹا۔"

موسمِ بہار سے خواجہ صاحب کی اس غیر معمولی دلچسپی کا سبب یہ تھا کہ سرزمین بہاولپور بالعموم اور چولستان جس سے انہیں بڑا گہرا روحانی و قلبی تعلق تھا بالخصوص نعمتِ باراں سے محروم تھا۔ اندازہ کیجیے کہ جہاں بارش کی سالانہ اوسط ۵ انچ سے زیادہ نہ ہو اور جہاں موسم گرما اور وہ بھی انتہائی شدید قسم کا سال میں آٹھ مہینے رہتا ہو۔ وہاں یادو باراں کو کتنی اہمیت حاصل ہو گی۔ ساون کے مہینے میں خواجہ صاحب کی دریائی سیر کا جو حال مذکورہ بالا اقتباس میں ملتا ہے۔ وہ کچھ خواجہ صاحب کے ساتھ ہی مخصوص نہیں بلکہ یہاں ہر غریب و امیر بلا تخصیص ساون کے دنوں میں ساونیاں مناتے ہیں اور اس سلسلے میں حسبِ حیثیت خاص اہتمام کرتے ہیں۔ خواجہ صاحب چونکہ شاعر تھے اور شاعر بھی حقیقت نگار اس لئے عوامی زندگی کا یہ گوشہ ان کی خاص توجہ کا مرکز بنا۔ انہوں نے موسم کے کیف انگیز اثرات بیان کرنے میں محض ایک تماشائی کا کردار ادا نہیں کیا بلکہ اس موضوع پر ان کی جو کافیاں ملتی ہیں انہیں پڑھ کر یہ اندازہ ہوتا ہے کہ شاعر وہی کیفیات بیان کر رہا ہے جو اس کی اپنی ذات پر مرتب ہو رہی ہیں۔ اس داخلی رنگِ سخن نے خواجہ صاحب کی بہاریہ شاعری کو بڑا پُر اثر بنا دیا ہے۔ دیکھیے کیا کیف میں ڈوبا ہوا شعر ہے۔

آئے مست وہاڑے ساون دے وہ ساون نے من بھاون نے

ترجمہ:۔ ساون کے مست اور کیف افزا دن آ گئے ہیں۔ سبحان اللہ کیا دلکش مہینہ ہے

آمد بہار کے اس پرجوش استقبال کے بعد بہار کی تفصیلات اس طرح پیش کرتے ہیں۔

بدلے پورب ماڑ ڈکھن دے گجلے بھورے سو سو ون دے
چارے طرفوں زور پون دے سارے جوڑ وساون دے

ترجمہ :۔ پورب۔ مارواڑ اور دکن کی طرف سے زوردار سیاہ بھورے اور سینکڑوں رنگ کے بادل امڈے چلے آتے ہیں۔ یہ سب برسات کی نشانیاں ہیں۔ یعنی ضرور برسے گا

چکویاں چکوے اغن پپہیئے کوئل مور چچونے چیہے
ہنس چکور چنڈور پپیہئے شاغل گیت سناون دے

ترجمہ :۔ چکوے، چکویاں۔ اغن پپیہئے۔ چچونے۔ چیہے۔ چکور اور چنڈول سب گیت سنانے میں مشغول ہیں۔

ساون نے چرند پرند کو ہی مست و بیخود نہیں بنایا۔ زمین و آسمان پر بھی رنگینی طاری کر دی ہے۔

ڈیہاں پینگھاں ساویاں پیلیاں راتیں کھمنیاں کھمن رنگیلیاں
گج گج گاجاں تجن سیلیاں وقت سنگار سہاون دے

ترجمہ :۔ دن کے وقت سبز و زرد رنگ کی قوس و قزح کا منظر پرلطف ہوتا ہے اور رات کو بجلی کے کوندتے اور رعد کے کڑکنے کی رسیلی آوازیں سنائی دیتی ہیں۔ یہ کیسا سج دھج اور سنگار کرنے کا وقت آگیا ہے۔

ساون کی مست ہوائیں فضا میں تازگی اور خوشی پیدا کرنے کے ساتھ ساتھ انسانی حسن کو بھی چار چاند لگا دیتی ہیں۔

ہندستانی خوش دتڑے ۔ ساہوں سوہے کیبر بھتڑے
ہجوں مینہ برساتوں سنڑے جھڑ گئے لانگھے لانون دے

ترجمہ:۔ کیف آور موسم ہے اور دن خوشی کے آ گئے ہیں۔ عروسی لباس زعفران میں بسا ہوا ہے بارش ہو رہی ہے۔ اور معشوقوں کے لہنگوں کے کنارے ہوا میں لہرا کر جھلمل جھلمل کر رہے ہیں۔

اب شاعر کی اپنی دلی کیفیت ملاحظہ ہو۔

وسنیہہ فرید آباد تھیوسے مال مویشی شاد تھیوسے
دل دردوں آزاد تھیوسے چولے انگ نہ ماون دے

ترجمہ:۔ اے فرید پھر جھوک آباد ہو گئی ہے اور مال مویشی بھی موسمی گھاس کی فراوانی سے خوش ہیں۔ دل اب غموں سے آزاد ہو گیا اب تو خوشی سے پھولے نہیں سماتے۔

خواجہ صاحب نے موسم بہار کا مزا چولستان (روہی) میں بھی لوٹا ہے۔ وہاں بارش پیام عید لاتی ہے لوگ خوشی سے بے حال ہو جاتے ہیں۔ خواجہ صاحب چولستانیوں کی اس خوشی میں شریک ہی نہیں ہوتے بلکہ اپنے لئے ذوق و وجد کا سامان بھی فراہم کرتے ہیں۔ ذرا ان شعروں پر غور کیجیے۔

ساون مینہہ برسات دی واری پھوگ پھلی کھپ پھلّے
گاجاں گجکن بجلیاں لسکن ذوقوں دلڑی چلّے
دھامن کترن سنڈھ تے سبھوں چتر سہاگ دا جھلّے

ترجمہ:۔ ساون اور مینہ کی باری آ گئی۔ پھوگ اور کھپ (ریگستانی پودے) پھول دے رہے ہیں۔ بادل گرج رہے ہیں۔ بجلیاں کوند رہی ہیں اور دل میں ذوق و وجدان کی وجہ سے ہیجان بپا ہے۔ دھامن۔ کترن۔ سنڈھ (ریگستانی پودے)۔ کے

کے سر پہ سہاگ کا چنر جھول رہا ہے۔

تشبیہات کے نادر نمونوں پر بھی نظر ہے اور یہ خیال رہے کہ جس خطے کی بہار کا منظر پیش کیا جا رہا ہے وہاں کا یہ دستور ہے کہ چولستانی پانی کی تلاش میں خانہ بدوشوں کی طرح اپنی بھیڑوں اور بکریوں کے ریوڑ لئے ایک جگہ سے دوسری جگہ پھرتے رہتے ہیں۔ لیکن جب بارش کے طفیل تالابوں میں پانی بھر جاتا ہے تو یہ لوگ واپس اپنے اپنے ٹھکانوں پر آجاتے ہیں اور وہاں سے اس وقت تک کسی اور طرف کا رُخ نہیں کرتے جب تک تالابوں کا جمع شدہ پانی ختم نہیں ہو جاتا۔

ذیل کا شعر اسی حقیقت کی تفسیر ہے۔

جے تائیں پانی پلٹر نہ کھٹّی کون بھلا سندھ جلّے

ترجمہ:۔ جب تک بارش کا پانی خشک نہیں ہوتا۔ بھلا سندھ کی طرف کون جا سکتا ہے جب تک ریگستان میں پانی باقی ہے۔ ہمارا قیام یہیں رہے گا۔

خواجہ صاحب کی بہاریہ شاعری تصوراتی یا خیالی قسم کی نہیں بلکہ مشاہداتی اور تجرباتی ہے۔ وہ روایتی شعراء کی طرح غیر حقیقی باتوں کو شعر کا جامہ نہیں پہناتے اور نہ ایسے دور از کار مضامین شعروں میں باندھتے ہیں جو وہم و خیال تک محدود ہوں۔ ان کا مطالعۂ کائنات بڑا وسیع تھا وہ ہر جزو کل پر گہری نظر رکھتے تھے اور جو کچھ دیکھتے یا محسوس کرتے اسے من وعن نظم کر دیتے تھے موسم برشگال کی تفصیلات میں بھی انہوں نے وہی حقائق پیش کئے ہیں جو ہماری روزمرہ زندگی سے مطابقت رکھتے

ہیں۔ چونکہ ان کا ماحول دیہاتی اور ریگستانی فضاؤں سے مرکب تھا اس لیئے ان کے افکار و خیالات کے پس منظر میں بھی شہروں کے کوچہ و بازار نہیں بلکہ دیہات کے جھونپڑے۔ ریگستان کے کف دست میدان اور مویشیوں کے گلے ہیں جن کی گھنٹیوں کی آوازیں فردوس گوش کا سامان پیدا کرتی ہیں۔ مندرجہ ذیل اشعار میں یہی سماں پیش کیا گیا ہے۔

تھیئے تھلڑے باغ بہار دے   چو دھار گل گلزار دے

ترجمہ:۔ بارش کے فیض سے تھل بھی باغ و بہار دکھائی دے رہے ہیں اور ریگستان میں چاروں طرف گل و گلزار کا سا سماں ہے۔

کتھے چنڑکیں دے چھنکار دے   کتھے مٹیاندے گھو بکار دے

ترجمہ:۔ کہیں جانوروں کے گلوں سے گھنٹیوں کی آوازیں آرہی ہیں اور کہیں چھاچھ بلونے کی کیف آفریں آواز ہے۔

فضا پر جب مسرت چھا جاتی ہے تو اس کا اثر ہر کہ ومہ پر ہوتا ہے۔ بدصورت اور خوبصورت مساوی طور پر جشن بہاراں مناتے ہیں کیونکہ خوشی کا تعلق شکل وصورت سے نہیں دل سے ہوتا ہے اور جب دل مسرور ہو تو ہر چیز حسین نظر آنے لگتی ہے ذیل کے شعروں میں یہی فلسفہ بیان کیا گیا ہے۔

سوہنی کوجھی گہنے گھنڑے   بہادڑے پا ٹھمکا دے

سینبدھاں مانگھاں تلک تلولے   کجل موساگ سہاوے

ترجمہ:۔ فیض بہار سے خوبصورت اور بدصورت نیک اور بد سب گہنوں میں سجی ہوئی ہیں اور مانگ تلک۔ تلولے۔ مساگ۔ کاجل بہار دکھا رہے ہیں۔

روہی اور خواجہ غلام فریدؒ

ہر زبان کی شاعری اپنے ماحول کی ترجمان اور ان افکار و رجحانات کی حامل ہوتی ہے جن کا اس ماحول میں بسنے والوں سے قلبی و ذہنی تعلق ہوتا ہے جو شعراء حُب وطن کے جذبے سے سرشار اور قومی روایات کے دلدادہ ہوتے ہیں۔ وہ نہ صرف اپنی وطنی خصوصیات پہ فخر کرتے ہیں بلکہ ان کے تحفظ و بقا کیلئے بھی پورا زور کلام صرف کرتے ہیں۔

خواجہ غلام فرید کا شمار بھی انہی شعرائے کرام میں ہوتا ہے جنہیں دیارِ غیر کے گل و گلزار کے مقابلے میں اپنے وطن کے خار و خس زیادہ عزیز تھے۔ انہیں اس خطۂ زمین سے جہاں وہ پیدا ہوئے پلے بڑھے اور پروان چڑھے، بے انتہا محبت تھی۔ وہاں کے بے آب و گیاہ صحرا۔ ٹوٹے پھوٹے پانی کے تالاب اور ریت کے شکستہ قلعے۔ جہاں لوگ خانہ بدوشوں کی زندگی بسر کرتے اور بھیڑ بکریاں پال کر گذر اوقات کرتے ہیں بجد پیارے تھے۔ چنانچہ ایک جگہ کہتے ہیں

سندھڑے ذہن نہ ڈیندیاں — لگڑیاں تانگھاں پل پل
روہی مینگھ ملہارڑاں — کھمدیاں کھمنیاں اج کل

دلڑی سِکدی دیس ڈو ں   اکھڑیں ہنجنوں بل بل
دیکھاں باغ بغو چڑے   جیہڑا جانوم جل بل
لانڑے پھوگ فرید دے   درد دلیندے در مل

سندھڑا سندھ کو کہتے ہیں جو دریائے سندھ کے کنارے
آباد ہے۔ اس سے ہٹ کر جو ایک سپاٹ علاقہ جیسلمیر اور بیکانیر کی
سرحد تک چلا گیا ہے۔ روہی یا چولستان کہلاتا ہے۔ روہی ملتانی زبان
میں پہاڑی کو کہتے ہیں۔ چونکہ اس علاقے میں بے شمار چھوٹی چھوٹی پہاڑیاں
ملتی ہیں۔ اس وجہ سے اس سارے علاقے کا نام روہی پڑ گیا ہے۔ یہ
علاقہ صرف بارش کے دنوں میں آباد ہوتا ہے۔ یہاں کے رہنے والے پانی
کی تلاش میں دور دور نکل جاتے ہیں۔ لیکن جونہی بارش کے آثار پیدا ہوئے
انہوں نے پھر روہی کا رُخ کیا۔ خواجہ صاحب نے مذکورہ بالا شعروں
میں اسی کیفیت کا اظہار کیا ہے۔ وہ کہتے ہیں

"جب میں وطن سے باہر ہوتا ہوں تو وطن کی یاد میں میری آنکھوں سے
آنسو نکل پڑتے ہیں اور سندھ کے باغ و بہار دیکھ کر مجھے اپنے وطن کے
ریگستانی پودے (لانے اور پھوک) یاد آجاتے ہیں۔ کیونکہ یہی تو میرے
دردِ دل کا علاج ہیں۔"

روہی کے ان پودوں کو خواجہ صاحب ایک اور کافی میں اس طرح
خراجِ عقیدت پیش کرتے ہیں۔

لانڑے پھوگ اساڈے مانڑے   ٹبڑے ٹبھڑے، ڈہر، ٹکانڑے

ڈسدے ٹکڑے کھیتر کملے ساگی باغ ارم دے یار

ترجمہ:۔ روہی کے لانے اور پھوگ ہمارے لئے مایۂ افتخار ہیں اور یہاں کے ٹیلے ۔ بھٹ اور ڈہر (میدان) ہمارے مسکن ہیں۔ سوکھے ہوئے۔ اور کملائے ہوئے کھیت ہم کو سرسبز اور اصل بہشت کا سا لطف دیتے ہیں

اس علاقے سے خواجہ غلام فریدؒ کی والہانہ محبت اور غیرمعمولی دلچسپی کا سبب یہ بھی تھا کہ وہ یہاں کی ایک دوشیزہ کی زلف گرہ گیر کے اسیر ہو گئے تھے۔ ان کا یہ رومان کافی دن جاری رہا جس کی وجہ سے انہیں بارہا روہی کا سفر اختیار کرنا پڑا۔ ایک روایت کے مطابق وہ اٹھارہ سال تک یہاں کی ایک بستی میں مقیم رہے۔ ذیل کے شعروں سے اس حقیقت کا سراغ ملتا ہے۔

پُر وحشت سنجڑی روہی
لے دل دیوانی موہی

کٹھی راہی بر ڈوں جلساں　　ول راہوں مول نہ ولساں
وِنج ساتھ پرینڈے رلساں　　وچ روہی کرسوں پوہی

ترجمہ:۔ اس پر وحشت اور ویران روہی نے میرا دل موہ لیا ہے ۔ میں نے طے کر لیا ہے کہ اس کے دشوار گذار راستے طے کروں گا اور پھر وہاں پہنچ کر اپنے محبوب کے جلوؤں میں ایسا مبہوت ہوں گا کہ پھر کبھی واپس نہ آؤں گا۔

ایک اور جگہ کہتے ہیں

ڈوبھ بنواڈے پکا رڑ تاڑتے — سندھڑوں دور اتاڑتے
صبح سویرں گھو بلکن مٹیاں — جو ھپیٹر دے اگواڑتے
روہی راوے روہیں دھماں — ہوک پووے وچ ماڑتے
پھلو ڈھے تے منت لیسوں — تھورا چڑھیسوں دینے لاڑتے

ترجمہ:۔ اے دوست مجھے ریگستان میں کوئی پختہ سو تع دیکھکر ایک ڈوبھا بنوا دے جو سندھ سے بہت دور اور اتاڑ کے موقعہ پر ہو۔ ایسا موقعہ ہو جہاں صبح سویرے چھاچھ بلونے کی آوازیں جھونپڑوں کے صحن سے بلند ہوتی ہیں۔ ایسا ڈوبھ ہو کہ روہی، راوے اور پہاڑوں تک اس کی دھوم ہو جائے اور ریگستان کیا راجپوتانے اور مارواڑ تک اس کی شہرت پہنچ جائے۔ ہم ریگستان میں جیں کر پھلو ڈھا اور دینے لاڑ پر اپنا احسان جتائیں گے۔

ڈھا اور لاڑ یہاں کے قبیلوں کے نام ہیں۔ "پھلو ڈھے" اور "دینے لاڑ" ان قبیلوں کے سردار تھے خواجہ صاحب کی منظور نظر بھی اسی قوم لاڑ کی دوشیزہ تھی (خواجہ صاحب کے اس رومان کا حال گذشتہ صفحات میں بیان ہو چکا ہے۔) یہاں کے لوگوں کو خواجہ صاحب سے عقیدت ہو گئی تھی۔ پھلو ڈھا ہمیشہ آپ کو یہاں آنے کی دعوت دیا کرتا تھا اور دنیا لاڑ روہی میں آپ کے لنگر کا مہتمم تھا۔

اس واقعاتی پس منظر کو سامنے رکھ کر ان شعروں کا لطف اٹھایئے دیکھئے کس جذب وشوق کے ساتھ وہ اس ریگستان میں جہاں صبح صبح چھاچھ بلونے کی آوازیں آتی ہیں مستقل رہائش کی تمنا کا اظہار کرتے ہیں۔

اور یہ چاہتے ہیں کہ یہاں ایک ایسا تالاب بن جائے جہاں بارہ مہینے پانی جمع رہے
تاکہ کسی عالم میں بھی یہاں سے ترک سکونت کا خیال پیدا نہ ہو۔

خواجہ صاحب کو یہاں کے خوبصورت کھنڈر، تالابوں کے ٹوٹے ہوئے
کنارے اور ریت کی چھوٹی چھوٹی پہاڑیاں اس قدر پیاری تھیں کہ وہ ان کی
خاطر سفر کی تمام کلفتیں برداشت کرتے تھے۔ چنانچہ کہتے ہیں۔

سوہنیاں ٹھیڑیاں ٹبڑے ٹھڑے   ناز دو ولے کنگڑے وٹڑے
باہیں ٹوبھے، پاڑے گھٹڑے   ڈھڑیں ڈوکھڑا دول ہے یار

ترجمہ:۔ ریگستان کے یہ خوبصورت کھنڈر۔ ٹیلے۔ بھٹ اور ناز آفریں وطن کے
زرد رنگ کے ڈھیلے، ڈھال کے نشیب۔ ٹوبھے، تالابوں کے ٹوٹے ہوئے کنارے
اور گڑھے ہیں۔ ان مناظر کو دیکھتے ہی سفر کی تمام کلفتیں دور ہو جاتی ہیں۔

یہ ریگستانی علاقہ جو سابق ریاست بہاولپور کی حدود میں تقریباً ۱۲ ہزار
مربع میل رقبہ پر مشتمل ہے۔ کسی زمانہ میں تہذیب و تمدن کا گہوارہ تھا یہاں
عالی شان عمارتیں اور مضبوط قلعے تھے۔ لوگوں کو آرام و آسائش کی تمام
سہولتیں میسر تھیں، کاروباری اعتبار سے اس جگہ کی اہمیت کا اندازہ اس
بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ یہاں دریائے سندھ سے مال و اسباب سے
لدی ہوئی کشتیاں آتی تھیں اور یہاں سے خام مال لے کر بحیرۂ عرب کی
طرف روانہ ہوتی تھیں۔ کہتے ہیں کہ مغلوں کے ابتدائی دور تک یہ علاقہ
مکمل طور پر آباد تھا۔ لیکن بعد میں سیلاب کی تباہ کاریوں نے اسے تہ و بالا
کر دیا اور یہاں کی پُر رونق اور گنجان بستیاں ویرانوں میں تبدیل ہو گئیں۔

آج اس علاقے کی حیثیت ایک فراموش کردہ زمین سے زیادہ نہیں اب یہاں نہ رہنے کیلئے مکانات ہیں۔ نہ پینے کے لئے پانی۔ نہ معیشت کے ذرائع ہیں۔ نہ رسل و رسائل کی سہولتیں۔ لوگ خانہ بدوشوں کی زندگی بسر کرتے اور پانی کی تلاش میں اپنے مال مویشیوں کو اپنے ساتھ لئے ایک جگہ سے دوسری جگہ مارے مارے پھرتے ہیں۔

جتھ تھلڑا، جتھ دربوں ہے یار   اوتھ ہر ویلے لدبول ہے یار

ترجمہ:۔ جہاں تھل اور دربوں (روہی کے مقامات) جیسے موقعے موجود ہیں۔ وہاں ہر وقت کوچ اور قیام کا سلسلہ جاری رہتا ہے۔

غرضیکہ چلاچلی کا میلہ ہر وقت لگا رہتا ہے۔ آج یہاں سے سامان لادا اور دوسری جگہ جا پہنچے۔ کل وہاں سے کوچ کیا اور دوسری جگہ جہاں گھاس کا موقعہ نظر آیا جا ٹھہرے۔ عجیب بے سروسامانی کی زندگی ہے۔ خواجہ صاحب یہاں کی زندگی کی ان تمام غیر مطمئن صورتوں کے باوجود اس میں ایک خاص کشش اور وقار پاتے تھے۔ انہوں نے ذیل کی کافی میں یہاں کی بود و باش کا ہو بہو نقشہ کھینچا ہے۔

اوتھ درد مندان دے ڈیرے   جتھ کرڑ کنڈا۔ لوئی ڈھیرے

ترجمہ:۔ اس ریگستان میں جہاں کریر کے درخت اور خار دار جھاڑیاں اور بوٹیاں (ریگستانی بوٹی) پیدا ہوتے ہیں۔ درد مندوں کی قیام گاہیں ہیں۔

کھپ کھاراں تے لئی لانڑیں   سنھ پھوگ بھوں مَن بھانڑیں
تھل ٹبے ڈھہر ٹکانڑیں   ہر بھڑے بھٹ نال بسیرے

ترجمہ:۔ کھپ۔ سجی۔ جھاڑ۔ سنہ اور پھوگ (ریگستانی گھاس اور پودے) دل کو بہت بھاتے ہیں۔ تھل ہیں۔ ٹبوں ہیں۔ ڈہروں میں اور ہر فرازی کے موقعہ پر ہمارے رین بسیرے ہیں۔

دلھ ککڑیاں ریھبڑ کچریاں   کئی سبز مینڑے کھکڑیاں
کئی گدریاں، پیلیاں ککڑیاں   سر روہی سوہنڑے سہرے

ترجمہ:۔ ریگستان کی بیلوں میں رنگ برنگ کی کچریاں۔ ریبڑھ (خربوزے کی قسم) لگے ہیں کہیں سبز میترے (تربوز کی قسم) اور ککڑیاں ہیں۔ ان میں کئی ملگجی ہیں کوئی زرد اور سرخی آمیز ہیں۔ ان تمام خوبصورت مناظر کا ریگستان کے سر پہ سہرا ہے

خوش قطران عطروں بھنڑی   گز لائی ساوی سنڑی
کھا ساگ پوسی دی پھنڑی   نبھ ویندے قدم سکھیرے

ترجمہ:۔ ریگستان کے تحائف۔ عطر بیز، خوشبودار حسین، خس کے عطر میں بسے ہوتے۔ جھاڑ اور لائی کے علاوہ سبز سنہری گھاس ہے۔ پوسی ریگستانی بوٹی کا پھول اور پھنڑی کا ساگ کھا کر اچھا وقت گذر جاتا ہے۔

دل ہر ویلے ہئی تانگھے   ونج ڈیکھاں مال دے لانگھے
گئیں بکریاں بھیڈاں چانگھے   لنگھ پوندم قدم اگیرے

ترجمہ:۔ دل ہر وقت مویشیوں کی آمد کی راہ دیکھنے کو بیتاب رہتا ہے۔ گائیں بکریاں اور بھیڑوں کے گلے دیکھنے کے لئے قدم آگے بڑھتے ہیں۔

سو ککرے کنڈڑے کاٹھیاں   لکھ ڈونگرا ویکھاں گھاٹیاں
سب ڈنگڑے وٹڑے چاٹیاں   جتھ بھیتوم فرید ڈیرے

ترجمہ:۔ سینکڑوں کنکر۔ کانٹے اور لکڑیاں۔ لاکھوں نشیب و فراز کے دشوار گذار راستے۔ ان گذرگاہوں میں فرید کے پاؤں پر ٹیڑھے اور نوکیلے پتھر چبھتے ہیں۔

بہاولپور کے اس ریگستان میں تصنع اور بناوٹ نام کو نہیں۔ چٹیل میدان ہیں تو وہ اپنی اصل حالت میں۔ جھاڑیاں اور پودے ہیں تو وہ خودرو۔ انسان ہیں تو ان میں سراسر خلوص۔ عورتیں غازہ اور سُرخی سے بے نیاز۔ اور مرد ظاہری ٹیپ ٹاپ سے مرتفع۔ ایک شاعر اس فطری حسن کو دیکھ کر کیسے خاموش رہ سکتا ہے، خواجہ غلام فرید ایک تو ویسے ہی قدرتی مناظر کے شیدائی اور زندگی کی ان قدروں کے دلدادہ تھے جن پر نئے زمانے کی چھاپ نہیں لگی۔ پھر اس پر روہی سے ان کو جو روحانی نسبت اور قلبی وابستگی تھی اس نے سونے پر سہاگے کا کام کیا۔ یہی وجہ ہے کہ ان کا تمام کلام روہی کے ذکر سے مزین ہے۔ ہجر و وصال کی کیفیت ہو یا بہار و خزاں کے مناظر۔ ان میں جب تک روہی کا سوز و ساز شامل نہ ہو بات ہی نہیں بنتی

خواجہ صاحب نے اپنی مختلف کافیوں میں روہی کی برسات اور اس کے پُر بہار مناظر کا نقشہ کھینچا ہے یہ کافیاں منظر کشی کے اعتبار سے ملتانی ادب کا گرانقدر سرمایہ ہیں۔ ایک کافی کے چند شعر یہاں درج کئے جاتے ہیں

روہی رنگ رنگیلی   چک کھپ ہار حمیلاں پاوے
بوٹے بوٹے گھنڈ سہاگوں   گیت پرم دے گاوے

کیسر بھنڑی ہولی چنڑی   دل ول مینہ پوسا وے
پورب ماڑ ڈکھن وے بادل   کوئی آوے کوئی جاوے

ساونڑ مینگھ ملہاراں   سبھوں تھلڑیں مال نہ ماوے
پیسوں پانی دھارو دھاری   ڈیبوں جھوک ترا وے

چک اور کھپ ریگستانی بوٹیوں کے نام ہیں۔ بارش کے چھینٹوں سے جب ان میں چھوٹے چھوٹے سرخ پھول نکل آتے ہیں تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان کے گلے میں سونے کے ہار پڑے ہوئے ہیں۔ بوٹوں کا سہاگ کے گھونگٹ نکال کر محبت کے گیت گانا۔ بادلوں کے تواتر سے ریگستانی دوشیزاؤں کے دوپٹوں کا جو ریگستانی بوٹیوں کی زعفرانی خوشبو میں بسے ہوئے ہیں بار بار بھیگ جانا، موسم کے موسیقی افزا اثرات کی وجہ سے مال مویشی کا چاروں طرف جمع ہو جانا اور ایسے وقت چولستانیوں کا یہ خواہش کرنا کہ اب وہ خوب سیر ہو کر پانی پیئں گے اور اپنی آبادیوں کو بھی سیراب کریں گے روہی کی زندگی کے ایسے دو قعاتی پہلو ہیں جن کا لطف وہی لوگ اُٹھا سکتے ہیں جنھوں نے ان مناظر کو اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے

پیلو اور ڈیلھے چولستان کے خاص میوے ہیں۔ یہ کرینہ اور جال کے درختوں پر موسم بہار میں آتے ہیں۔ یہاں کے رہنے والے انہیں بڑے شوق سے کھاتے ہیں۔ جب یہ پھل پک جاتے ہیں تو ان کے رنگوں سے تمام

صحرا رنگین دکھائی دیتا ہے۔ عورتیں باریک تیلیوں کی بنی ہوئی ٹوکریاں گلے میں ڈال کر پیلو چنتی ہیں اور ایک طرف ان کی ڈھیریاں بناتی جاتی ہیں اس کے بعد انہیں ٹوکریوں میں بھر بھر کر بازار میں فروخت کرنے کے لئے لے جاتی ہیں شہری لوگ انہیں بڑے شوق سے کھاتے ہیں وہ غلہ دیکر چولستانی عورتوں سے پیلو اور ڈیلھے خرید لیتے ہیں۔ اس تمام واقعہ کو خواجہ صاحب نے ذیل کی کافی میں پیش کیا ہے۔ اہل تصوف اسے عارفانہ کلام بتاتے ہیں اور کہتے ہیں کہ آپ نے ریگستان سے صحرائے عرب مراد لی ہے اور پیلو کے پھل سے ثمر اسلام کی تلمیحات کو آخر تک نبھایا ہے۔ اگر اس تاویل کو نظر انداز بھی کر دیا جائے تو بھی اس کی ادبی منزلت میں کمی نہیں ہوتی۔ کیونکہ منظر کشی اور حقیقت نگاری کے اعتبار سے یہ کافی لاکھوں شعروں پر بھاری ہے۔ یہاں پوری کی پوری کافی معہ ترجمہ نقل کی جارہی ہے تاکہ اس بیان کی صداقت واضح ہو سکے۔

آچنوں رل یار

پیلوں پکیاں نی وے

کئی بگڑیاں کئی ساویاں پیلیاں کئی بھوریاں کئی پھکڑیاں نیلیاں

کئی اودیاں گلنار کٹویاں رتیاں نی وے

بار تھئی ہے رشک ارم دی ٹک بڑ گئی جڑھ ڈوکھتے غم دی

ہر جا باغ بہار ساکھاں چکھیاں نی وے

پیلوں ڈیلھاں ندیاں گلزاراں   کھیں گل ٹوریاں کھیں سرکھاریاں
کئی لا بیٹھیاں یار   بھر بھر پچھیاں نی دے

جال جلوٹیں تھئی آبادی   پل پل خوشیاں دم دم شادی
لوکی سہنس ہزار   گل نے پھکیاں نی دے

حوراں پریاں ٹولے ٹولے   حسن دیاں ہیلاں برہوں دے جھولے
راتیں ٹھڈیاں ٹھار   گوئلیں تیتیاں نی دے

رکھ دے ناز حسن پروردے   ابرو تیغ تے تیر نظر دے
تیز تکھے ہتھیار   دلیاں پھٹیاں نی دے

کئی ڈیون ان تال برابر   کئی گھن آون ڈیڈھے کرکر
کئی ویچن بازار   نٹیاں تکیاں نی دے

کئی دُھپ وچ وی چیندیاں ہندیاں   کئی گھن چھان چھنویرے پہندیاں
کئی چن چن پیاں ہار   ہٹیاں تھکیاں نی دے

یڈوں عشوے غمزے نخرے   اوڈوں یار ترائیں بکرے

کسن کان تیار راندّاں رسیاں نی وے

پیلوں چُندیں بو چھن لیراں چولا وی نھیا لیر کتیراں
گلڑے کرن پچار سینگیاں سکیاں نی وے

آیاں پیلوں چُنن دے سانگے اوڑک نھیاں فریدن دانگے
چھوڑ کرام قدار ہکیاں بکیاں نی وے

" پیلو پک گئے ہیں اے دوست۔ آل کر انہیں چنیں۔ سبز تے سرخ۔ زرد نیلے۔ اودے اور گلناری رنگ کے پیلوؤں سے سارا صحرا رنگین ہو گیا ہے۔ ریگستان نمونہ بہشت بنا ہوا ہے۔ دکھ اور غم کی جڑیں سوکھ گئی ہیں۔ ہر جگہ باغ و بہار کا سا لطف ہے۔ اے دوست تو نے بھی یہ میوہ کھا کر دیکھا۔ پیلو چننے والے طرح طرح سے پھل چُن رہے ہیں۔ بعض کے گلے میں ٹوکریاں ہیں اور بعض کے سر دں پر چھابڑی ہے۔ بعض نے ٹوکریاں بھر بھر کر ڈھیر لگا لیا ہے۔ پیلو کی بہار کی وجہ سے صحرا میں ہر چھوٹے بڑے جال کے درخت کے نیچے انسانی ہجوم اور آبادی کا منظر ہے۔ سینکڑوں ہزاروں لوگ جمع ہیں اور خوش و خرم ہیں۔ اور جگہ جگہ انہوں نے جھونپڑیاں ڈال کر بستیاں آباد کر رکھی ہیں۔ یہ سب لوگ پیلو چننے کی خاطر جنگل میں منگل منا رہے ہیں۔ حسینانِ عالم حوروں اور پریوں کی طرح ٹولیاں بنا کر محوِ خرام ہیں۔ بادِ نسیم ان کے حسن سے متاثر ہو کر چل رہی ہے اور محبت

کی پُر جوش ہوا میدان میں پھیلی ہوئی ہے موسم پر اس کا جاں پرور اثر ہو گیا ہے اور راتیں ٹھنڈی ہیں۔ یہ نازنین، حسن و نزاکت کے پُتلے۔ ابرو کی تلواریں اور نگاہوں کے تیر ایسے تیز ہتھیار رکھتے ہیں کہ دلوں کو ایک ہی نظر میں زخمی کر دیتے ہیں۔ یہ نازنینائیں جب پیلو چُن کر بازار میں فروخت کرنے کے لیے لاتی ہیں تو ان کی قیمت کا اندازہ بھی مختلف ہوتا ہے کچھ تو غلہ کے ہم وزن پیلو دیتی ہیں کچھ ڈیوڑھی شرح پہ فروخت کرتی ہیں اور جن کے گاہک صحرا میں نہیں پہنچ سکتے وہ بازار میں تول کر بیچتی ہیں۔ کچھ حسینائیں تو دھوپ میں بھی پیلو چننے کا شغل جاری رکھتی ہیں اور کچھ سایہ میں بیٹھ کر دھوپ سے بچی رہتی ہیں۔ زیادہ تاب مشقت نہ لانے والی چن چن کر بیحال ہو گئی ہیں۔ پیلو چُننے والی نازنیناؤں کی طرف سے عشووں غمزوں اور نخروں کی فوج تیار ہے اور ہلا بولنے پر آمادہ ہے اور دوسری طرف عشاق خیراتی بکروں کی طرح ذبح ہونے کے لئے ہیں۔ یہی دل کش کھیل رچا ہُوا ہے۔ حسین دوشیزائیں پیلو چننے میں اس قدر محو ہیں کہ انہیں دوپٹے اور چولے کا بھی ہوش نہیں رہا۔ دوپٹوں کی دھجیاں لگ گئی ہیں اور چولے پھٹ کر تار تار ہو گئے ہیں۔ ہمجولیاں اس حالت کو دیکھ کر انکا نام دھرتی ہیں۔ پیلو چننے کے لئے آتی تھیں مگر فرید کی طرح بے خود ہو گئیں اور آرام و قرار چھوڑ کر ہکا بکا ہیں۔"

روہی اپنے قدرتی مناظر کے اعتبار سے ہی دل کش نہیں۔ اس کے مکینوں کا خداداد حسن اور ان کے ناز و ادا بھی اہل دل کو اپنی طرف متوجہ کرتے ہیں۔ یہاں کی عورتیں حسین نقش و نگار کی مالک ہوتی ہیں۔ ان کے جسم پر سرخ تاگوں سے بنی ہوئی چولی اور رنگ برنگے لنگے بڑے بھلے معلوم ہوتے ہیں ان کے بارے

میں خواجہ صاحب کی رائے ملاحظہ ہو۔

وچ روہی دے رہندیاں نازک ناز و جٹیاں
راتیں کرن شکار دلیں دے ڈیہاں ولوڑن مٹیاں
گجڑے تیر چلاون کاری سے سے دلڑیاں پھٹیاں
کر کر درد منداں کوں زخمی ہے ہے بدھن نہ پٹیاں
چھیڑن بھیڈاں بکریاں گائیں لیلے گابے کٹیاں
کتے مسکین مسافر پھاتھے چوڑ کیتو نے ترٹیاں
دھوئیں دار فقیر تھیوسے فخر وڈائیاں سٹیاں

"روہی میں نازک و نوش ادا جٹیاں رہتی ہیں۔ رات کو دلوں کے شکار کرتی ہیں اور دن کو اپنے حسب معمول شغلے میں مصروف رہتی ہیں اور چھاچھ کے مٹکے بلوتی ہیں۔ یہ حسینائیں چھپ چھپ کر نگاہ ناز کے تیر چلاتی ہیں اور سینکڑوں دلوں کو چھیدتی ہیں۔ یہ بے پروا معشوق درد مندوں کو زخمی کر کے مرہم بھی نہیں لگاتیں۔ یہ ناز و انداز والی حسینائیں مال مویشی چراتی ہیں اور بھولے بھٹکے مسافروں کو اپنے عشق کے جال میں پھنسا لیتی ہیں۔ ہم بھی انہیں مست ناز محبوبوں کی محبت میں پھنس کر دھونی رمانے والے فقیر بن بیٹھے ہیں اور تمام بڑائی اور فخر ترک کر دیا ہے"

خواجہ صاحب کی یہ کافی ان کے روہی والے رومان کے ثبوت کے طور پر بھی پیش کی جا سکتی ہے۔ بالخصوص ان کا یہ شعر کہ ہم بھی انہیں مست ناز محبوبوں کی محبت میں پھنس کر دھونی رمانے والے فقیر بن بیٹھے ہیں اور تمام بڑائی اور فخر ترک کر دیا ہے۔ روہی سے ان کی غیر معمولی دلچسپی کے راز کو ظاہر کر

دینے کے لئے کافی ہے۔

خواجہ صاحب کی نظر سے روہی کا کوئی گوشہ نہیں بچا تھا۔ انہوں نے ایک سچے عاشق کی حیثیت سے روہی کا چپہ چپہ چھانا تھا۔ یہاں بہار کے دن بھی گذارے تھے اور خزاں کی سوختہ سامانیاں بھی دیکھی تھیں۔ روہی جہاں بہار کے دنوں میں ایک بہشت ارضی کا نمونہ ہوتی ہے۔ وہاں خشک سالی کے دنوں میں ایک ہیبتناک جنگل سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتی۔ اس وقت دن دہاڑے یہاں سے گذرنا مشکل ہوتا ہے۔ طرح طرح کے جانور اپنی وحشت ناک آوازوں سے دل ہلا رہے ہوتے ہیں۔ تڈے۔ فاختائیں۔ گوہیں۔ لومڑی اور سانپ سے لے کر لگڑ بگڑ تک یہاں ملتے ہیں۔ لگڑ بگڑ کے بارے میں یہاں ایک مثل مشہور ہے کہ اس کی پیٹھ پر ڈائن سوار ہوتی ہے اور اس میں اتنی طاقت ہوتی ہے کہ وہ بندوق کی نالی کو دانتوں میں دبا کر چبا جاتی ہے۔ اس پر ہول منظر کو خواجہ صاحب نے جنگلی جانوروں کی آوازکے ساتھ اس طرح پیش کیا ہے

تڈرے جیکیں، گیرے گھوکن   جر کھاں ترکھاں لونبڑ کوکن
گوہیں شوکن، سانھے پھوکن   ناگیں دی شوں شوں ہے یار

ترجمہ:۔ جھینگر چیخ رہے ہیں۔ فاختائیں ہُو کا نعرہ لگا رہی ہیں۔ لگڑ بگڑ لومڑیاں گوہیں۔ سانھے اور سانپ طرح طرح کی آوازیں نکال رہے ہیں۔

ریگستان کی ان ہولناکیوں کو دیکھ کر کس کی ہمت ہے کہ ادھر کا رُخ کرے۔ ہاں یہاں کے رہنے والے جنہیں اس جگہ سے قدرتی لگاؤ ہے

یا وہ عاشقانِ استقامت یا جن کے دل حسنِ صحرا کے جلوؤں سے منور ہیں یہاں کی بادیہ پیمائی کی جرأت کر سکتے ہیں۔ خواجہ صاحب پر موخرالذکر بات صادق آتی ہے انہوں نے ایک عاشق صادق کی طرح روہی کا سفر اختیار کیا۔ مدتوں وہاں رہے اور وہاں کے ہر گوشۂ حیات کا عمیق مطالعہ کیا۔ ان کے کلام میں اس علاقے کی جو نمائندہ خصوصیات نظر آتی ہیں وہ ان کی اسی ریاضت اور دقتِ نظر کا نتیجہ ہیں۔ اور سچ پوچھئے تو یہ خواجہ صاحب کا اس علاقے پر احسان ہے کہ انہوں نے اس فراموش کردہ زمین کو اپنے کلام میں جگہ دے کر شہرت دوام بخش دی۔ آج جن لوگوں کی زبان پر خواجہ غلام فرید کا کلام ہے وہ جانتے ہیں کہ دنیا میں ایک سرزمین ایسی بھی ہے جسے روہی کہتے ہیں اور جو اپنی بے سروسامانی کے باوجود اپنے میں کچھ ایسی جاذبیت اور کشش رکھتی ہے کہ شاعر کا حقیقت نگار قلم اس کی تعریف میں رطب اللسان ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔

خواجہ صاحب کی شاعری کی فنّی خوبیاں

خواجہ غلام فریدؒ کی سخن گوئی کے متعلق دیوانِ فرید کے مقدمہ میں لکھا ہے کہ

"خواجہ صاحب رحمتہ اللہ چونکہ عام شعراء کی طرح صرف اہلِ قال میں سے نہیں تھے بلکہ اہلِ حال میں سے تھے اس لئے جب حال طاری ہوتا تو کچھ کہتے ورنہ ہر وقت فکر سخن میں محو رہنا ان کا پیشہ نہ تھا۔ اور حال میں جو کچھ فرما جاتے بعض اوقات مدتوں بعد اس پر غور کرنے کا موقع ملتا۔

آپ کی ایک مشہور کافی ہے جس کا مطلع ہے

اساں سو بدمست قلندر ہوں　　　کڈیں مسجد ہوں کڈیں مندر ہوں

اس میں ایک بند ہے۔

کتھاں درد کتھاں درماں بنوں　　　کتھاں مصر کتھا کنعان بنوں

کتھاں کیچ بھنور دا شان بنوں　　　کتھاں داسی شہر جلندر ہوں

اس میں "شہر جلندھر" کا لفظ کافی کہتے کے وقت بندھ گیا اور شاید اس وقت یہ خیال ذہن میں تھا کہ سوہنی جالندھر کی رہنے والی ہے مگر سولہ سال بعد جب اس کافی پہ حضور نے غور فرمایا تو معلوم ہوا کہ سوہنی تو گجرات کی تھی اس فکر میں پھر حال وارد ہوا اور حضور نے محسوس

فرمایا کہ لفظ کی بندش صحیح ہوئی ہے اور اس کی تاویل بجائے جلندھر کے "جل اندر" (پانی میں) ہے اور یہ تاویل صرف تاویل نہیں بلکہ لفظ بند کے اندر انگشتری میں نگینے کی مثال رکھا ہے اور بجائے اس کے کہ اس لفظ کو اٹھا کر انگشتری کو بے نگینہ کر دیا جاتا اس نگینے پر جمی ہوئی میل کو صاف کر دیا گیا ہے۔ اور اب وہ نگینہ چمک چمک کر الشعراء تلامیذ الرحمٰن کی شہادت بہ بانگ دہل چار دانگ عالم میں دے رہا ہے۔"

عقیدت کیشی کے جذبے سے قطع نظر محولہ بالا واقعہ سے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ خواجہ صاحب الفاظ و بیان پر زبردست قدرت رکھتے تھے۔ انہیں عربی اور فارسی عروض اور ہندی گیتوں کی لے سے مساوی طور پر واقفیت تھی مختلف زبانوں میں مہارت تامہ رکھنے کی وجہ سے الفاظ کا بے پناہ ذخیرہ اُن کے پاس تھا۔ انہوں نے عربی، فارسی۔ ہندی اور سندھی عروض کے اشتراک سے کافی کی نئی بحریں اور نئے اوزان مقرر کر کے اپنے فنی اجتہاد کا ثبوت بھی دیا ہے نمونے کے طور پر یہ شعر دیکھئے۔

دلڑی حرمل اکھیاں بل بل	بیریں چھل چھل چھالے
نرمل درد اندر دے درمل	ڈتڑے روگ کشالے
بار وسھل ول مکھڑا چھپایا	ڈکھڑیں ڈکھایا دردیں ہونجھایا
تانگھیں تپایا موتجیں مسایا	سولیں ستایا نیڑے ہرایا

میڈا دستہ نرم کرور دا	متاں ونگیں لگم ٹکور

رحقہ تے بہندی ڈرگ نہ سہندی ہم طبع کمزور

دیوان فرید میں نئے نئے اوزان و بحور کے ایسے بےشمار تجربات ملتے ہیں، جیسا کہ اوپر ذکر کیا گیا ہے۔ خواجہ صاحب ہر وقت فکر سخن میں محو نہیں رہتے تھے۔ لیکن جب شعر کہنے پر آتے تھے تو طویل سے طویل کافی منٹوں سکنڈوں میں پوری کر لیتے تھے۔ دیوان فرید کے مقدمہ میں درج ہے کہ ایک بار خواجہ عاقل محمد رحمتہ اللہ علیہ کے عرس کے موقعہ پر دس بندوں والی کافی جس کا مطلع ہے

وہ وہ سوہنے دا ورتارا ہر صورت وچ کرے اوتارا

خواجہ صاحب نے دس منٹ میں مکمل کی تھی۔ اسی طرح ایک اور کافی جس کا مطلع ہے۔

پٹی پیت دے بندھ پریرے برے برہوں دے بار بریرے

۱۳ منٹ میں لکھی گئی تھی۔ اس کافی کے ۱۰ بند ہیں۔ ہر بند عام کافیوں کے بندوں سے ڈیوڑھا ہے۔ کیونکہ عام کافیوں کے بند مربع ہوتے ہیں۔ اور یہ مسدس ہیں۔

تشبیہات تشبیہات و استعارات کو شاعری کی جان سمجھا جاتا ہے جو شعراء حقیقت پسند ہوتے ہیں وہ شاعری کے ان لوازم کو اس طرح پورا کرتے ہیں کہ تخیل کا شہپر مشاہدے کی آنکھ کو نہیں جھپکاتا۔ بالفاظ دیگر وہ صرف وہی بات کہتے ہیں جو اُن کے

گرد و پیش ماحول میں نظر آتی ہے۔

خواجہ صاحب ایسے ہی حقیقت پسند شعراء میں سے تھے۔ ان کے ہاں تخیل کی پرواز ضرور ملتی ہے لیکن اسی حد تک کہ وہ ذہن و نظر کی گرفت میں رہے۔ چونکہ روہی خواجہ صاحب کی فکر و نظر کی چراگاہ تھی اس لیے انہوں نے جہاں اور چیزوں میں اس کی خصوصیات کو قائم رکھا۔ وہاں تشبیہات و استعارات بھی وہی استعمال کیے جن کا روہی سے براہ راست تعلق تھا۔ مثال کے طور پر ذیل کا شعر دیکھیے۔

کاکل پنیاں مانگ وراڈھا ڈٹھڑیں چیڑ ھم سر تے

اس میں محبوب کی زلفوں کو "سیاہ پیونا" سے تشبیہ دی گئی ہے یہ ایک ریگستانی سانپ کی قسم ہے جو انتہائی خطرناک ہوتا ہے اس کے متعلق مشہور ہے کہ یہ پچاس پچاس میل تک آدمی کا پیچھا کرتا ہے جہاں کہیں روہی کے مسافروں میں سے کوئی بھولا بھٹکا، تھکا ہارا دم لینے کے لئے رکا۔ یہ ظالم خبر پاتے ہی اپنے بل میں سے باہر نکل آتا ہے اور اس کی تاک میں رہتا ہے۔ جب وہ سو جاتا ہے تو یہ نہایت ہوشیاری سے اس کے قریب پہنچ کر جو چمک دار اشیاء مثلاً لکڑی۔ کلہاڑی وغیرہ وہاں ہوتی ہے اُسے منہ سے اٹھا کر دُور پھینک دیتا ہے۔ اور بے فکری کے ساتھ مسافر کے سینے پر چڑھ کر بیٹھ جاتا ہے اور اس کا خون پی جاتا ہے بعض لوگوں کا کہنا ہے کہ اس کی آنکھوں میں اس قسم کا اثر ہے کہ آدمی اسے دیکھ کر بے ہوش ہو جاتا ہے۔

ریگستانی سانپ کی اس خصوصیت کو سامنے رکھ کر مذکورہ بالا شعر پڑھیئے۔ پھر کاکل سے سیاہ بہو ناکی تشبیہ کا مزا آئے گا۔

آپ نے لسان الغیب حضرت حافظ شیرازی کا یہ شعر تو پڑھا ہوگا

اے نسیم سحری خاک در یار بیار
تا کند حافظ ازو دیدہ دل نورانی

اب ذرا خواجہ صاحب کی ایک کافی کا یہ بند بھی ملاحظہ ہو۔

ڈھوڑ جھیندی نور اکھیندا پاد ھفباہ سے مان جھیندا
ڈیوم حال گواہی وویار

حافظ خاک درِیار سے دیدہ و دل منور کرنا چاہتے ہیں تو خواجہ صاحب جو ریگستانی پردہ ماند کے عاشق ہیں۔ محبوب کے بھینسوں کے غبار پا کو اپنی آنکھوں کا نُور اور اُن کے گوبر کو اپنے لئے باعث فخر سمجھتے ہیں کیونکہ یہی تو ریگستانی لوگوں کی دھن دولت ہے۔

تشبیہات کا ایک اور شاہکار ملاحظہ ہو۔

گوڑھیاں اکھیاں رت دی بجھیاں۔ زلفِ سیہ بے پیر
کجلہ جنگی ظالم زنگی۔ کوہندا بے تقصیر

ترجمہ: محبوب کی نشیلی آنکھیں خون کی پیاسی ہیں اور آنکھوں کا کاجل جنگجو حبشی ہے جو بے تقصیر ذبح کیے جاتا ہے۔

اونٹیوں کے گلے کی گھنٹیوں اور چرواہے کے ہنکارنے کی آواز سے فضا میں جو موسیقی پیدا ہوتی ہے اسے ذیل کے بند میں پیش کیا گیا ہے۔

مچھلیں بینگیں لاسوں ناریں چٹکیں گھنڈریں ہونگ تواریں
سبھوں رانز رسائی دو بار

ترجمہ:۔ بارش کے بعد آسمان پر زنگار رنگ مچھلیوں کی طرح دھنک پھیلی ہوئی ہے اور دور سے مویشیوں کے گلے کی گھنٹیاں بجنے اور چرواہے کے ہنکارنے کی آوازیں آ رہی ہیں۔

عموماً عورتیں شنگرف وغیرہ سے ہونٹوں کو سُرخ کر لیتی ہیں اور آنکھوں میں دنبالہ دار کاجل لگاتی ہیں۔ یہ سامانِ حسن اسی وقت اچھا لگتا ہے کہ محبوب قریب ہو لیکن اگر اس کے برعکس محبوب نگاہوں سے اوجھل ہو تو سُرخی اور کاجل بُرے معلوم ہونے لگتے ہیں۔ خواجہ صاحب نے ذیل کے بند میں اس تخیّل کو پیش کرتے ہوئے سُرخی کو بندوق کی گولی اور کاجل کو دنبالے کی تلوار کی دھار سے تشبیہہ دی ہے۔

یار فرید نہ کیتم گولی سُرخی ڈسم بندوق دی گولی
دھار کجل دی تھئی تلوار

ترجمہ:۔ اے فرید یار نے اپنا غلام نہیں بنایا۔ سرخی بندوق کی گولی اور کاجل کا دنبالہ تلوار کی دھار معلوم ہوتی ہے۔

معشوق کو ظالم اور عاشق کو مظلوم تو سبھی کہتے ہیں لیکن ان کو نادہند مقروض اور سخت گیر قرضخواہ سے شاید ہی کسی نے تشبیہہ دی ہو۔

خواجہ صاحب کہتے ہیں

ہے دل قہر دی مبتلا ہے او غضب دا بے وفا

من چھڈ اتے من ڈے وی آ آپت دے وچ کھڑ بڑ ہنی

بہاولپوری ملتانی زبان میں " من چھڈ " اسے کہتے ہیں جو کسی پر اپنا قرض نہ چھوڑے اور" من ڈے " ایسا مقروض تصور کیا جاتا ہے جو نادہند ہو چنانچہ خواجہ صاحب کہتے ہیں کہ ایک طرف سسی جو پنوں کے عشق میں مبتلا ہے اس کی حالت ایک سخت گیر قرض خواہ کے مانند ہے اور دوسری طرف پنوں ہے جو غضب کا بے وفا اور نادہند مقروض کی طرح ہے۔

عشاق نگاہِ ناز کے تیروں سے تو ہمیشہ گھائل ہوتے آئے ہیں لیکن عشاق کے لئے خیراتی بکرے کی تشبیہہ پہلی بار خواجہ صاحب کو ہی سوجھی ہے اس میں بے کسی اور بے لبی کا جو تصور ہے وہ شہید ناز وغیرہ الفاظ سے پیدا نہیں ہو سکتا۔ دیکھئے اِسے کس خوبی سے سمجھایا ہے۔

ایڈوں عشوے غمزے نخرے اوڈوں یار خیراتی بکرے

کسن کان تیار راندال رسیاں نی وے

ترجمہ۔ اِدھر عشوے غمزے اور نخرے ہیں اور ادھر عشاق خیراتی بکروں کی طرح ذبح ہونے کے لیے تیار ہیں۔ یہ دل کش کھیل رچا ہُوا ہے۔

محاورہ بندی محاورہ بندی اور صحت الفاظ سے بھی شاعرانہ عظمت کا پتہ چلتا ہے۔ خواجہ صاحب میں یہ خوبی بدرجہ اتم موجود تھی۔ وہ الفاظ کی صحت اور محاوروں کے صحیح استعمال کا خاص خیال رکھتے تھے۔ انہوں نے اپنے شعروں میں بعض ایسے محاورے اور الفاظ بھی بڑی خوبصورتی سے استعمال کئے ہیں جو بظاہر نامانوس یا غریب معلوم ہوتے تھے لیکن ترقی زبان

کے سلسلہ میں ان کی افادیت مسلّم تھی۔ البتہ ایسے محاورے یا ضرب الامثال جو اخلاقی اقدار پر پوری نہیں اترتی تھیں انہیں نظرانداز کیا ہے۔

چند نمونے ملاحظہ ہوں۔

۱۔ بانہہ سراندی ڈیون ۔ یہ محاورہ التفاتِ محبوب کے لئے استعمال کیا جاتا ہے لفظی معنی یہ ہیں۔ بانہہ (بازو) پر سر رکھنا۔

خواجہ صاحب کا شعر سنیئے۔

مولا جھوکاں پھر وسیسی سارا روگ اندر دا ویسی
یار فرید انگن بول ییسی ڈیسم بانہہ سراندیاں

(مجھے یقین ہے کہ اللہ پھر یہ ویرانہ آباد کرے گا۔ اس وقت دل کا تمام روگ دور ہو جائے گا۔ اے فرید یار پھر صحن خانہ میں قدم رنجہ فرمائے گا۔ اور میرے بازو پھر اس کا سرہانہ بنیں گے۔)

۲۔ کھٹ کھائے ۔ بامراد ہونے اور خوش رہنے کے معنی میں بولا جاتا ہے

ذیل کا شعر ملاحظہ ہو۔

جے آئے نہ تاں کھٹ کھائے
نہ ول سنسی منیساں ہیں

(محبوب کو اپنے حسن پر غرور ہے۔ آنے کا وعدہ کر کے بھی نہیں آیا۔ اب میں نے تہیہ کر لیا ہے کہ اگر وہ حسب وعدہ آگیا تو بہتر ورنہ وہ اپنا کام کرے۔ میں بھی پھر جلدی اور آسانی سے نہیں منوں گی۔)

۳۔ ترٹی چوڑ کرن ۔ برباد کرنا۔ دیکھیے ذیل کے شعر میں اسے کس خوبی سے نبھایا ہے

کئی مسکین مسافر بھاتے
چوڑ کتو نے تڑٹیاں

(ان بھولے اور نازک معشوقوں نے بہت سے مسافروں کو تباہ و برباد کیا ہے)

۴۔ واگاں ولاون ۔ اس کے لفظی معنی باگیں موڑنے کے ہیں لیکن محاورے میں اس سے مراد قسمت پھرنے کے ہیں۔ اس محاورے کا استعمال ملاحظہ ہو۔

تھیاں سرسبز فرید دیاں جھوکاں۔ مہروں سبز تھیاں دل سوکاں
بخت ڈیتیں واگ ولائی وو یار

(فرید کا مسکن سرسبز ہو گیا ہے۔ اللہ کے فضل سے جلے اور سوکھے ہوئے پودے پھر لہلہانے لگے ہیں۔ بخت نے اپنی عنان موڑ لی ہے۔ یعنی قسمت پھر گئی ہے)

۵۔ واٹ نہاراں ۔ راہ تکنے کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔

تتی رو رو واٹ نہاراں
کڈیں ساول موڑ مہاراں

(دل جلی رو رو کر راہ تک رہی ہے۔ کبھی تو اے سانولے محبوب عنانِ توجہ اس طرف بھی پھیر۔)

۶۔ منہ بھتڑ سر چھئی ۔ ذلیل و خوار ہونے کے معنی میں بولا جاتا ہے۔

عشق فرید کوں خلعت ڈتڑی
موہنہ سر بھتڑی چھیاں

(حضرت عشق نے فرید کو منہ بھتر اور سر چھائی کی خلعت عطا کی ہے۔ یعنی خواری اور ذلت عطا کی ہے)

خواجہ صاحب نے بازاری اور ناشائستہ قسم کے محاورے استعمال کرنے سے اجتناب کیا ہے۔ لیکن اگر کبھی ایسے محاوروں کے استعمال کی ضرورت لاحق ہوئی ہے تو اس عمدگی سے اسے نبھایا ہے کہ اس پر ابتذال کا گمان تک نہیں ہوتا۔

"رانی خان دے سالے" بھی ایسے ہی محاوروں میں سے ہے جو مغرور اور ظالم قسم کے لوگوں کے لئے بولا جاتا ہے۔ دیکھئے یہ محاورہ ذیل کے بند میں کس خوبی سے نظم کیا ہے۔

غم درد الم بد نیتے   پئے ساڑن سوز پلیتے
تھئے میں مٹھڑی دے کیتے   سب رانی خان دے سالے

(غم۔ درد۔ الم سب بدنیت ہیں اور ہر وقت مجھے جلائے رکھتے ہیں۔ مجھ بدقسمت عاشق کے لئے تو ہر ایک "رانی خان کا سالا" یعنی ظالم اور جلاد بنا ہوا ہے۔)

بہاولپوری ملتانی زبان کا ایک محاورہ ہے "بوک جانا" عام طور پر کہتے ہیں کہ فلاں کو بوک جائے یعنی اس نے جو کام کیا ہے اس کو سختی اور بدقسمتی نے ایسی غلطی پہ آمادہ کیا ہے۔ اس مفہوم کو ذہن میں رکھ کر ذیل کا شعر پڑھئے۔

او اپنی جاتے خوش وسن   اتھ نین بھنی بے وس وسن
کیوں لوگ نہ میں تے ہسن   مٹھڑی کوں چاتا بوک ہے

(محبوب تو اپنی جگہ خوش اور آباد ہے اور یہاں یہ حالت ہے کہ آنسو آنکھوں سے بے تحاشا جاری ہیں اور مجھ پہ کیوں نہ پھبتیاں کسے اور ہنسے کہ مجھے بدقسمتی اور سختی نے

عشق کرنے پر آمادہ کیا ہے۔)

ایک اور محاورہ ہے چھنّا ڈیون۔ یہ عام طور پہ منت چڑھانے کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔ اس علاقے میں رواج ہے کہ مراد بر آنے پر لیدے کا کٹورہ بھر کر کچھ دیگر رسوم کے ساتھ کسی بزرگ کی خانقاہ پہ جاکر نذر گذارتے ہیں۔ اس رسم کی ادائیگی کو " چھنا ڈیون " کہتے ہیں۔ شعر ملاحظہ ہو

خواجہ پیر دے ڈلیساں چھنّے ایہے ڈیہہ اتھا ہِیں بھنّے
جیندیاں سبھ ول کیتاں منّے وسّم سدا گھر باراں

(اگر میرا محبوب، جس کا ہر شخص دل سے متمنی ہے میرے عزلت خانہ میں آکر آباد ہو تو میں خواجہ پیر کا چھنّا دوں گی۔)

صوتیات علم اللسانیات میں صوتیات کو بڑی اہمیت حاصل ہے اس سے ادائے مطالب میں جو اثر انگیز کیفیت پیدا ہوتی ہے اس کا اندازہ ان شعراء کے کلام سے لگایا جاسکتا ہے جو الفاظ کے صوتی تقاضوں کو پورا کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔

خواجہ صاحب ایسے ہی شعراء میں سے تھے جنہیں صرف زبان پر ہی قدرت حاصل نہ تھی بلکہ وہ الفاظ کی ساخت اور ان کی صداؤں کے مختلف اثرات کو بھی خوب سمجھتے تھے۔ ان کے ہاں ایسی صدہا مثالیں ملتی ہیں جہاں انہوں نے الفاظ کی صوتی کیفیات سے ایسے مفہوم پیدا کرنے کی کوشش کی ہے جنہیں مجرد الفاظ ادا نہیں کرسکتے تھے۔ خواجہ صاحب کی اس فنکاری کی سب سے بڑی وجہ ان کا ذوقِ موسیقی تھا۔ وہ اس فن کے بھی بقدر کمال ماہر تھے

اور اس کے رموز و نکات پر گہری نظر رکھتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ انہوں نے اپنی کافیوں کے لیئے بحروں کے انتخاب میں بھی اس امر کا پورا اہتمام کیا ہے اور اظہار مطالب کے لئے جو الفاظ منتخب کیئے ہیں انہیں بھی آہنگ و نغمہ کی کسوٹی پر پوری طرح پرکھا ہے۔ دیکھیئے ان کی کافی کا یہ مشہور شعر حسنِ نغمگی اور صوتی کشمش کا کیسا نادر نمونہ ہے۔

کیا حال سناواں دل دا   کوئی محرم راز نہ ملدا

اس میں الفاظ بحر کے ساتھ اس طرح ہم آہنگ ہیں کہ انہیں اپنی جگہ سے ہٹایا نہیں جا سکتا۔ ایک اور کافی کا یہ بند ملاحظہ ہو۔

باغ بہار اجاڑ کینوں سے   ہار سنگار وسار ڈتو سے

دولت دنیا دار بھتیو سے   نوکر تیڈڑے دم دے یار

پہلے دو مصرعوں میں بہار۔ اجاڑ۔ ہار۔ سنگار اور وسار میں "ر" کی تکرار پر غور کیجیئے اور پھر تیسرے مصرعے میں "دولت دنیا دار" کے حروف میں "د" کی تکرار دیکھیئے اور اندازہ لگایئے کہ اس صوتی ہم آہنگی نے شعروں میں کتنی جاذبیت پیدا کر دی ہے۔

ایک کافی میں غم فراق کا حال بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ سینے کی دھجیاں لگ گئی ہیں اور دل پارہ پارہ ہو گیا ہے۔ اس مضمون کے لئے صوتی اعتبار سے کیسے اثر انگیز الفاظ استعمال کئے گئے ہیں۔ شعر ملاحظہ ہو۔

سینہ محض لویراں تھیا   دلڑی دھیاں دھیاں

دوسرے مصرعے میں جہاں "د" کی تکرار موسیقیت پیدا کر رہی ہے وہاں "دھتیاں دھتیاں" نے سینہ کوبی کا سماں پیدا کر دیا ہے۔

خواجہ صاحب شعروں میں آہنگ و نغمہ کا اتنا خیال رکھتے ہیں۔ کہ صنعت ترصیع ان کے ہاں مستقل صورت اختیار کر گئی ہے۔ بمشکل کوئی کافی ایسی ملے گی جس میں یہ التزام نہ پایا جاتا ہو۔ ذیل میں مختلف کافیوں کے کچھ شعر پیش کئے جاتے ہیں۔ جن کے مطالعہ سے خواجہ صاحب کی فنکارانہ صلاحیتوں کا بخوبی اندازہ ہو سکے گا۔

سوز اندر وچ سول جگر وچ　　آیم بروچ روہ ڈونگر وچ
سخت سفر وچ ظلم قہر وچ　　ہوت نہ کیتم کاری

دلڑی حسرل ملی اکھیاں بلبل　　پیریں چھل چھل چھالے
نرمل درد اندر دے درمل　　ڈنڑے روگ کشالے
جابل تے ہتھ ململ کوکاں　　زخم پئے وچ زیرے

درد جدید مزید ہمیشہ　　ریت پریت سوائی
بیت پرم دے گیت سکھایم　　نیت اساں سرچائی
عید فرید بعید سنیوسے　　غم کیتے دل ڈیرے

اوکھے لانگھے روہ جبل دے　　چھل چھل چھالے پیر پچلدے

رلدی راہ ٹھیر دو   جھت راحسن ڈٹرپوون دہل

فکر فراق تے موبجھ موبجھاری   یاری لاکر مٹھڑی ہاری
ڈسےڑم وصل وصال محال

سیجھ سڑیندی لنبے لبندی   گلنے گھنے پھل نہ پیندی
نول نلمیندی جوڑ جلیندی   روندی تے غم کھاندی ہاں

تمثیلات و اصطلاحات اگرچہ خواجہ صاحب کی تمام شاعری فلسفۂ تصوف کے گرد گھومتی ہے۔ لیکن چونکہ ان کے مخاطب عوام تھے اس لئے انہوں نے اپنا پیرایۂ بیان نہایت سلیس اور عام فہم رکھا اور اپنی شاعری میں تمثیلات و اصطلاحات بھی وہی استعمال کیں جنہیں لوگ سمجھ سکتے تھے مثال کے طور پر انہوں نے اردو فارسی اور عربی شاعری کے مروجہ عشاق ومحبوبین۔ لیلیٰ مجنوں۔ فرہاد و شیریں اور عذرا اور سلمیٰ کے بجائے اپنی سرزمین کے عاشقانِ سرباز اور حسینانِ باوفا کو جن کے عشق ومحبت کی داستانیں بیہاں زبان زد خاص وعام تھیں بطور تمثیل اپنی شاعری میں جگہ دی ہے۔ ان میں ہیر رانجھا۔ سسّی پنوں اور سوہنی مہینوال کے کردار خاص طور پر ان کے پیش نظر رہے ہیں جن سے انہوں نے مقاماتِ عشق کے بیان میں بڑی مدد لی ہے۔ دیکھئے ذیل کے شعروں میں معشوق کی بے وفائی کا اظہار

مطلوب ہے لیکن اس موقعہ پر وہ سسی پنوں کے اس واقعہ کی یاد دلاتے ہیں جب پنوں سسی کو سوتا ہوا چھوڑ کر چلا گیا تھا۔ یہ تمثیل ان لوگوں کے لیے کس قدر جاذب توجہ ہو سکتی ہے جن کی سرزمین پر سسی پنوں کے رومان نے جنم لیا تھا۔

پنوں ہوت نہ کھڑ مو کلایا چھڈ کلھڑی کیچ سدھایا
سوہنے جان پچھان رولایا کوڑا عذر نبھایم گھلدا

یعنی میرے محبوب پنوں نے مجھے الوداع بھی نہ کہی اور اکیلا چھوڑ کر کیچ کو روانہ ہو گیا۔ محبوب نے جان بوجھ کر مجھے برباد کیا اور میری غنودگی نیند کا جھوٹا بہانہ بن گئی۔

عشق کی دشوار گذار راہوں کا ذکر کرتے ہیں تو "مارو تھل" کا لفظ استعمال کرتے ہیں تاکہ سننے والے کی نظر کے سامنے وہ میدان آجائے جہاں سسی تلاشِ محبوب میں زمین کے اندر غرق ہو گئی تھی۔ دیکھئے یہ تمثیل کتنا اثر پیدا کر رہی ہے۔

مارو تھل دے ڈو کھڑے گھاٹے گپ کھڈ۔ کھڑ بن کھوپ گیاٹے
رات ڈینہاں تڑپھاندی یارا رولدی روہ ڈونگر وچ

(مارو تھل کے دشوار گذار راستوں میں جہاں دلدل۔ کھڈے۔ اور ناہموار زمین ہے۔ میں رات دن پریشان ہو کر تڑپتی ہوں اور بیتاب ہو کر کوہستان اور بیابانوں میں آوارہ پھرتی ہوں۔)

سسی کے متعلق مشہور ہے کہ وہ تحصیل صادق آباد، ضلع رحیم یار خان

کے ایک قصبہ بھٹہ واہن میں پیدا ہوئی تھی اور یہیں اسے دریا میں بہایا گیا تھا۔
کیچ سستی کے عاشق پنوں کا وطن تھا۔ ان تاریخی واقعات کو سامنے رکھکر ذیل
کی کافی میں وطن محبوب سے عاشق کی والہانہ محبت کا اظہار کیا گیا ہے۔

بھٹھ پیا ٹھیسڑے واہن داجماں شہر بھنبھور دی کوڑ نکماں
کیچ ہئی وطن حقیقی وویار

(بھٹہ واہن میں پیدا ہونا بھی بھاڑ میں جائے۔ شہر بھنبھور بھی ناکارہ اور بیکار
ہے۔ حقیقی وطن تو محبوب کا مسکن کیچ ہے)

سستی پنوں کی طرح ہیر رانجھا بھی خواجہ صاحب کی شاعری کے تمثیلی
کردار ہیں۔ یہ بند ملاحظہ ہو۔

ناں ماہی نہ مہنیاں ڈسدیاں اکھیاں وسدیاں دلڑیاں پھسدیاں
جندڑی تھئی بھاں بیلی وویار

یہ ذہن نشین رہے کہ ہیر کا عاشق رانجھا بھینسیں چراتا تھا۔ چنانچہ مندرجہ بالا
بند میں کہتے ہیں کہ عاشق کو نہ تو محبوب نظر آتا ہے اور نہ وہ بھینسیں نظر آتی ہیں جنہیں
وہ چراتا تھا اور جس کو دیکھ کر آنکھیں الگ بے قرار ہو جاتی تھیں اور دل الگ پھنس
جاتا تھا اب تو یہ حالت ہے کہ جگر کھا کھا کر پریشان ہو گئی ہوں۔

سیماب اکبر آبادی کا ایک شعر ہے۔

جب تو نہیں اقامتِ دیر و حرم فضول
اب کیا یہاں پرستش دیوار و در کریں

یہی مفہوم خواجہ صاحب کے مندرجہ ذیل بند میں ملتا ہے لیکن اس میں

تمثیل وہی مقامی نوعیت کی ہے۔

وِسم نہ راول رانجھن سائیں رنگپور سارا اجڑیاں جائیں
کو جھے تھر کلہے دد یار

رنگپور اس مقام کا نام ہے جہاں ہیر اپنی مرضی کے خلاف بیاہی گئی تھی اور جہاں اس کا عاشق رانجھا گلی کوچوں میں مارا مارا پھرتا رہا تھا اور آخر کار وہیں مر گیا تھا۔ خواجہ صاحب کہتے ہیں کہ رنگپور میں چونکہ مجھے میرا محبوب رانجھن نظر نہیں آتا۔ اس لئے اس کے مکانات ویران اور بدصورت دکھائی دیتے ہیں۔

رانجھا تخت ہزارہ کا رہنے والا تھا۔ اس نے ہیر کے عشق میں اپنی عزت و شان گنوا کر چرواہا بننا قبول کر دیا تھا۔ یہ شعر اسی واقعے کی طرف اشارہ کرتا ہے

آپے تخت ہزاروں آیا ہیر کارن چاک سڈایا
سٹ کر شوکت شاہی وویا

(رانجھا خود ہی اپنی شان و شوکت اور شاہی چھوڑ کر تخت ہزارہ سے آیا اور ہیر کی محبت میں چرواہا بن گیا)

سسی پنوں اور ہیر رانجھا کی طرح سوہنی مہینوال کی داستان عشق بھی کافی مشہور ہے۔ خواجہ صاحب نے ان سے بھی تمثیل کا کام لیا ہے۔ ایک کافی کا پہلا شعر ہے۔

مل مہینوال مل مہینوال ہر دل میں ہے تیڈڑی بھال

اسی میں سوہنی کی زبانی عشق کے مصائب اس طرح بیان ہوتے ہیں۔

فکر فراق تے موجھ موبنجھاری   یاری لا کر مٹھڑی ہاری
ڈسدم وصل وصال محال

(میں تو محبت کر کے فکر فراق اور ہر وقت کے رنج و ملال کے باعث ہمت ہار چکی ہوں۔ اور اب تو محبوب مہینوال کا وصال بھی محال معلوم ہوتا ہے)

خویش قبیلہ دشمن سارا   ہر کوئی مارم جان وچارا
برہوں اویڑا اولٹی چال

(محبت کی چالیں بھی عجیب بے ڈھب ہیں کہ اس کے آتے ہی تمام عزیز و اقربا دشمن ہو گئے ہیں اور عاشق کو بے چارہ جان کر سب مارتے اور تکلیف دیتے ہیں۔)

خواجہ صبا کے کلام میں دوسری زبانوں کی آمیزش

جیساکہ ابتدائی صفحات میں ذکر کیا جا چکا ہے۔ خواجہ صاحب بہت سی زبانوں کے ماہر تھے۔ وہ عربی، فارسی، اردو۔ ہندی سندھی اور پوربی اہل زبان کی طرح لکھ پڑھ سکتے تھے۔ ان کی اس ہفت زبانی کا ثبوت ان کے کلام سے بھی ملتا ہے جس میں نہ صرف انہوں نے عربی فارسی وغیرہ زبانوں کے الفاظ بلا تکلف استعمال کئے ہیں بلکہ ان زبانوں میں شعر کہکر اپنی قابلیت کے جوہر دکھلائے ہیں۔ ذیل میں چند زبانوں کے کچھ اشعار پیش کئے جاتے ہیں۔ جن کا مطالعہ قارئین کی دلچسپی کا باعث ہوگا۔

فارسی

رونق شور فزاید غمِ پنہانیٔ من ۔۔۔ حسن را زیب دہد چشم خدادانیٔ من

وحشت و درد بما خوش سر و سودا آرد ۔۔۔ خندہ بر خرقہ زند جامۂ عریانیٔ من

شب فرقت چو سحر شد رمقے باقی بود ۔۔۔ سنگ را آب کند سخت گرانجانیٔ من

اُردو

بن گئے ہیں جہاں سے بیگانہ ۔۔۔ جب سے اس بُت کے آشنا ہیں ہم

دیر و کعبہ میں دل نہیں لگتا ۔۔۔ یار کے در کے جبہ سا ہیں ہم

مے پرستی میں مرے دل کی ترقی دیکھو   خم گردوں کو اک ادنیٰ سا پیالہ سمجھا

سودائیوں کو باغ ارم بھی ہے عزیز   جب دشت میں جنوں کا ہو چرچا کبھی کبھی

میں فقط پیدا ہوں وصفِ پنجتن کے واسطے
تشنہ ہے کوثر مرے ذوقِ دہن کیواسطے
جو محبت میں مرے غنچہ دہن کے واسطے
چادرِ گل چاہیئے اس کے کفن کیواسطے

سندھی

توھنجا زور زٹل اوں مکر ونجا   توھنجی ظلم جہاں گاڑھیوں عمر ادا
ونجیں وٹھ یحن سال گاڈھ بندیس
پہن ماڑیوں اوں محلات جا گھر   آھی مرگ فرید جا مارو تھڑ
دہن سانگی اڑن چار یندیس

ھندی

اج بن موں برج راج بنسری بجائی   بنسری بجائی اگم گیت گائی
رت سہاگ بھاگ بھاگ ہے اگ رنگ پیا سنگ   بھیو آنند انگ انگ ہر موں ہریائی
سن مینہ سمادھ سادھ دالکھ لاگ ہے ہو   جہاں گھٹ وہٹ پٹ جوت ہے جگائی

پوربی

بندرا بن موں کھیلی ہوری   شام ددا رے میرو لال

ادہر مدہر موں بنسی باجی
چوراسی لکھ ساج ادا جی
بھولی کایہ مایہ موری
سُن کے گیان انوکھے کھیاں

ترکھٹ جمنا تیرتھ ناؤں
درمت دویت کے پاپ ہٹاؤں
پی کے پیئے سنگ پریم کٹوری
ناچت گاوت رنگرس تال

داس فرید آکاس ہمارا
دیس ایہو ابناس ہمارا
اتم سوں کی لاگے جوری
ہول میں سنسار رہت پتال

بماہ زمست ان زبانوں میں اشعار کہنے کے علاوہ ان کی بہاولپوری
ملتانی زبان کی کافیوں میں بھی ایسے بے شمار اشعار ملتے ہیں جن میں

انہوں نے مختلف زبانوں کے الفاظ بڑی بے ساختگی سے استعمال کئے ہیں

یہ بند ملاحظہ ہوں۔

غیب الغیب دے دیسوں آیا   شہر شہادت ڈیرا لایا
احدیت دا گھنڈ اتارا   تھیا اطلاقوں محض مقید

حق باطل سبھ حق ہے حق ہے   پرائے راز ہوں مغلق ہے
یار ہے یار ہے یار ہے یار   سوہنا کوجھا نیک اتے بد

ذیل کی کافی تمام کی تمام عربی اور فارسی ترکیبوں کا مجموعہ ہے۔

گڑنے پورے بید بتائے   عقل فکر سب فہم گمائے
مدہوشی وچ ہوش سکھائے   سارا سفر عروج سمجھایا

وحدت عین عیان ڈٹھوسے   لمس حقیقی سمجھ لیوسے
مخفی کل اظہار تھیوسے   ہر گن گیان دے گیت نوں پایا

دیکھئے عربی فارسی کے مصرعوں کی گرہیں کس خوبی سے لگائی ہیں۔

بن یار ساتول بیو کوئیں   ہذا جنون العاشقیں
بے او نہ آنست و نہ ایں   ہذا جنون العاشقیں

نقل برتی رلدی ہے کیوں   مدہد واٹ توں بھلدی ہے کیوں
یار است ہمدم ہمنشیں   ہذا جنون العاشقیں

بہاولپوری ملتانی کافی میں اردو اور فارسی کا اثر دیکھیے۔

دِل مست محوِ خیال ہے سر مو تفاوت نا سہوں
اے خیال جین وصال ہے تے کمال ہے نہ کہے جنوں

جو مکاں تھا بن گیا لامکاں جو نشاں تھا ہو گیا بے نشاں
شدہ اسم و رسم زمن رواں اللہ اپنے آپ کو کیا کہوں

فارسی اور اردو میں "پا پیادہ" کی ترکیب مستعمل ہے۔ اسے خواجہ صاحب نے اپنی زبان میں اس طرح اپنایا ہے۔

سسّی شودی پیر پیادی ناں ترڑ تلڑے جھوک آبادی
متھڑی بے تقصیر دو ناخرچ پلّے نہ گنڈھ سمل

ذیل کی کافی بھی فارسی بحر میں ہے اور اس میں مصرعے بھی فارسی کے ضم کیے گئے ہیں دیکھیے کیا روانی ہے۔

دلے دارم بے آوارہ طبعے وحشت آرائے
برہوں بالے برو چل دے بیاباں دشت رلوائے
کیہاں غمدیاں کیہاں باتیں ڈوکھی ہے دل ڈیہاں راتیں
خدارا حال زارم بیں کہ بے دستیم و بے پائے
بماطالع شدہ برکیں ترا رم بے دل و غمگیں
نہ پیندا یار ہے جھاتی اجن ڈکھڑے نہ پاندائے
سجن دس رس ڈکھایم حسن سورجھیں بیکڑیں بس بس

دلِ دیوانہ با ہر کس نہ دارد ہیچ پروائے

ہندی زبان سے خواجہ صاحب کو خاص لگاؤ تھا اور اس کی وجہ ان کا وہی ذوق موسیقی تھا جس کا سامان اس زبان کی شاعری میں کافی ملتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ انہوں نے اپنی کافیوں کے لیئے ہندی اوزان اور بحور کو زیادہ تر اپنایا ہے اور ان ہی ہندی الفاظ اس روانی اور عمدگی سے نظم کیئے ہیں کہ باید و شاید یہ شعر ملاحظہ ہوں۔

سکھی کر لیو ہار سنگار سبھی — سیاں رل مل دھوم مچائی
گرجت بدرہ لسکت بجلی — رت ساون ٹھیک بہائی

خواجہ صاحب نے جہاں ہندی زبان سے کام لیا ہے وہاں ہندی ادب کے تمام تلازموں کو بھی پیش نظر رکھا ہے اور سب سے بڑا کمال یہ ہے کہ ہندی زبان اور ہندی تلازموں کے باوجود ان کا اپنا عقیدہ ان سب پر محیط رہتا ہے دیکھیے اس کافی میں کیسی پتے کی باتیں کہی ہیں

اپرم بھید بتاؤں — میں اگیانی کو گیان سناؤں
سرت سمرندھ ہاتھ موں لیکر — پریم کی تار بجاؤں
پانچ سکھی مل رام دوارے — ست گر کی جس گاؤں
کونج گلی میں شام سندر سنگ — ہوری دھوم مچاؤں
میت چیت پچکاری ماروں — پریت گلال اڑاؤں
کہاں اجودھیا سنبل متھرا — کہاں گوردھن جاؤں
پیپل تلسی کاہے کو پوجوں — کاہے کو تیرتھ ناؤں

اور سے کام فرید نہ میرو
آ تم دیو مناؤں

ذیل کی کافی میں اردو، ہندی اور ملتانی کی کتنی عمدہ آمیزش ہے۔

کِس دھرتی سے آئے ہو تم کس نگری کے باسی رے
پرم نگر ہے دیس تمہارا پھرتے کہاں اداسی رے

اپنا آپ سنبھال کر دیکھو کر کے نظر حقیقت کی
فکر نہ کیجو یارو ہرگز آسی یا نہ آسی رے

بات فریدی سوچ کے سنیو لاکر دل کے کانوں کو
دو نوں جگ کے مالک تم ہو بھولے اللہ راسی رے

خواجہ صاحب کے دوہے

خواجہ صاحب کافیوں کے شاعر مشہور ہیں۔ لیکن یہ بہت کم لوگوں کو معلوم ہے کہ انہوں نے ملتانی زبان میں دوہے (ڈوہڑے) بھی کہے ہیں ان کے دوہے کسی کتاب میں محفوظ نہیں۔ یہانتک کہ ان کا دیوان جسے بڑے اہتمام کے ساتھ نواب صاحب بہاولپور کے ایما پر مولوی عزیزالرحمٰن مرحوم نے شائع کیا تھا۔ خواجہ صاحب کے دوہوں سے خالی ہے۔ اس میں کافیاں تو پوری ۲۷۱ ہیں لیکن ڈوہڑا ایک بھی نہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ خواجہ صاحب نے جو دوہے کہے تھے وہ مرور ایام کے ہاتھوں ضائع ہو گئے۔ یا کافیوں کے دلدادگان نے ان کی طرف التفات نہیں کیا۔ آج سے تقریباً ۲۰ سال قبل نبی بخش خان صاحب نے تاریخ سندھ کی ترتیب کے سلسلے میں سندھ کے مختلف علاقوں کا دورہ کرتے ہوئے خواجہ صاحب کے چند دوہے جمع کئے تھے اور یہ تحریر کیا تھا کہ یہ دوہے اگرچہ زبان زد عوام ہو کر اغلاط سے پر ہو گئے ہیں تاہم ان میں خواجہ صاحب کے عاشقانہ جذبات و عارفانہ نکات کی جھلک صاف نظر آتی ہے۔

سندھ کے علاقہ میں خواجہ صاحب کے دوہوں کی یہ مقبولیت اچنبھے

کی بات نہیں۔ سندھ کے ایک وسیع علاقے میں ان کے عقیدتمندوں اور مریدوں کا سلسلہ پھیلا ہوا ہے۔ ویسے بھی بہاول پور سے سندھ کے ساتھ جو تہذیبی و ثقافتی تعلقات برس ہا برس سے قائم چلے آتے ہیں ان کے پیش نظر یہ بات قیاس سے بعید معلوم نہیں ہوتی کہ وہاں خواجہ صاحب کی کافیوں کی طرح دوہے بھی لوگوں میں مقبول ہو گئے ہوں گے۔ خود خواجہ صاحب سندھی ادب سے کافی متاثر تھے۔ انہوں نے سندھی زبان میں کافیاں بھی کہی تھیں۔ جس نے انہیں سندھ سے اور قریب کر دیا تھا۔ البتہ تعجب اس بات پر ہے کہ بہاول پور، ملتان اور پنجاب کے دوسرے علاقوں میں ان دوہوں کا نشان نہیں ملتا۔ غالباً اس کی وجہ یہ ہے کہ یہاں پہلے سے پنجابی زبان کے دوہے مشہور چلے آتے ہیں اور ایک وقت میں کئی کئی شعراء ایسے ہو گذرے ہیں جو "دوہے" کہتے تھے۔ ہو سکتا ہے کہ جب ان شعراء کا کلام جمع کیا گیا ہوگا تو ان میں خواجہ صاحب کے دوہے بھی غیر دانستہ طور پر شامل کر لئے گئے ہوں گے۔

پنجاب میں بعض دوہوں کو خواجہ صاحب سے منسوب کیا جاتا ہے۔ لیکن ان کے متعلق ملتانی ادب کے نقادوں کی یہ رائے درست معلوم ہوتی ہے کہ وہ ان کے بعض معتقدین نے خود کہکر ان کے نام سے منسوب کر دیئے ہیں۔ اس سلسلہ میں ایسے ہی ایک دوہے کا ذکر کیا جاتا ہے۔ جس کے بول یہ ہیں۔

لٹ گئے محرم راز دلیندے نال جنہاں دے رلا

آپ ڈٹھے وچ رنگ محلاں ساکوں چھوڑ کے کلھا

نہ کوئی حال سنے نہ ڈیوے آس امید تسلّی
ملسوں پیر فرید نڈاں جڈاں سانگ بنڑسی اللہ

واقعی اس کی زبان اور خیال دونوں خواجہ صاحب کی معیاری زبان اور بلند خیالی سے ہم آہنگ نہیں۔ نیز "پیر فرید" کی ترکیب صاف بتا رہی ہے کہ یہ ان کے کسی معتقد کی کارگزاری ہے۔ ورنہ خواجہ صاحب خود اپنے لئے پیر کا لفظ استعمال نہ کرتے۔

اس دوہے کے علاوہ جن دوہوں کے متعلق یہ قیاس کیا جاتا ہے۔ کہ کسی صاحب عقیدت نے اپنے کہے ہوئے "دوہے" خواجہ صاحب سے منسوب کر دیئے ہوں گے۔ ان کے متعلق یہ گمان بھی کیا جا سکتا ہے کہ وہ عام زبانوں پر چڑھتے چڑھتے ایسے مسخ ہو گئے ہوں گے کہ اب انہیں خواجہ صاحب سے منسوب نہیں کیا جا سکتا۔ ہم ذیل میں جو دوہے درج کر رہے ہیں ان کے مطالعہ سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ ان کا خالق کوئی عامی یا معمولی درجے کا شاعر نہیں۔ ان میں الفاظ کی نشست و برخاست مصرعوں کی روانی۔ معرفت کے رموز اور واردات قلب کی وہی کیفیت نظر آتی ہے جو خواجہ صاحب کی کافیوں کا طرۂ امتیاز ہے۔

ان کا ایک "دوہا" ہے۔

ہر ویلے ہے تانگھ دلبر دی تے رو واں کانگھ اڈاراں
بھالاں پاواں تے قاصد بھیجاں تھی گیا حال بیماراں
آ یار راتھو ہن جیون کوڑے دل تے درد ہزاراں

غلام فرید رو وال ایویں جیویں وچھڑی کونج قطاراں

اس کا مرکز خیال وہی ہے جو ان کی کافی کے مندرجہ ذیل بند میں ملتا ہے

یہانتک کہ تشبیہ بھی ایک ہی ہے۔

عشق فرید رلایم بر وچ ہڈ ہڈ تے انگ انگ یارا

نکھڑیم کونج ولھر دی

ان دوہوں کی کیفیت بھی یہی ہے۔

دین دھرم دی لوڑ نہ کائی ہک درسن یار دا لوڑاں

بھانویں مارے بھانویں جھنڑکے دامن مول نہ چھوڑاں

کافر کافر ہر کا آکھے ہک ہرگز منہ نہ موڑاں

یار فریدا ترٹے ہر پاسوں ہک یار کنوں نہ تروڑاں

توڑے پڑھیں کروڑ نماز وے ملا ایویں یار ملن دستور نہیں

جینہ تیئں دل نا ساجد تھیویں او سجدہ کوئی منظور نہیں

چا غیر کنوں دل دور کریں تاں یار ملن کجھ دور نہیں

غلام فریدا او دل کھڑی جینہ دل عربی ڈھولے دا لور نہیں

قصیدہ گوئی اور خواجہ صاحب

خواجہ غلام فرید جیسے صوفی منش، بے ریو دریا اور جاہ و ثروت سے بیگانہ آدمی کے متعلق قصیدہ گوئی کا تصور بظاہر کچھ عجیب سا معلوم ہوتا ہے عموماً شعراء اس صنفِ سخن کو جلبِ منفعت اور حصول اغراض کے لئے استعمال کرتے آئے ہیں اور ایسے شعراء کی تعداد بہت کم ہے جنہوں نے داد و دہش کی تمنا کے بغیر محض جذبۂ اخلاص اور خیر خواہی کے تحت اپنے ممدوح کو خراجِ عقیدت پیش کیا ہو۔ خواجہ صاحب کا شمار ان معدودے چند خود دار اور بے لوث شعراء کی فہرست میں ہی ہونا چاہیئے۔ انہوں نے اول تو اپنی مدح و ستائش کی تمام گرم بازاری ذات باری تعالیٰ اور اس کے رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے مخصوص کی ہوئی تھی اور ان کے بعد اگر کسی ذات میں انہیں کشش نظر آتی تھی تو وہ ان کے مرشد خواجہ فخرالدین یا ان کے سلسلے کے دوسرے بزرگان کرام تھے جن کی تعریف میں وہ کبھی کبھار رطب اللسان نظر آتے ہیں۔ ان روحانی پیشواؤں کے علاوہ مادی شخصیتوں میں جس شخص کو خواجہ صاحب کا ممدوح ہونے کا فخر حاصل ہوا وہ نواب صادق محمد خان رابع کی ذات تھی۔ ان کے علاوہ کوئی

اور شخصیت ایسی نہیں تھی جس کی شان میں انہوں نے قصیدہ کہا ہو۔

والیان بہاولپور اس اعتبار سے ہمیشہ خوش قسمت رہے ہیں کہ انہیں اپنے وقتوں کے باکمال اور مقتدر شعراء نے مدح وستائش کے گراں بہا تحفے پیش کئے ہیں۔ اس سلسلے میں یہاں خواجہ صاحب سے قبل کے دو نامی گرامی شعراء کا ذکر کیا جاتا ہے۔ ان میں سے ایک تو ملتانی نظم کے بادا آدم مولوی لطف علی مصنف مثنوی سیف الملوک ہیں اور دوسرے سندھی کے مایۂ ناز صوفی شاعر شاہ عبداللطیف بھٹائی ہیں۔ شاہ صاحب نے بانئ بہاولپور نواب محمد بہاول خان اول کی شان میں ایک دعائیہ قصیدہ لکھ کر پیش کیا تھا اور مولوی لطف علی نے نواب محمد بہاول خان ثانی کی مدح میں قصیدہ لکھا تھا۔ مولوی لطف علی تو درباری شاعر اور نواب صاحب کے خاص مصاحبوں میں شامل تھے اس لئے ان کے قصیدے کی علتِ غائی ظاہر ہے چنانچہ ان کے قصیدے میں لوازمات بھی وہی پیشہ ورانہ ہیں جو عام طور پر قصیدہ گو شعراء کا حصہ ہوتے ہیں یعنی بہادری، انصاف، جود وسخا کے قصے اور آخر میں عرضِ مدعا اور طلبِ عنایت۔

کچھ شعر ملاحظہ ہوں

نصرت جنگ سخی دانائے اہلِ کرم اخوانی ۔۔۔ عالی قدر عباسی افضل مرد مبین مبانی
خان بہاول خان معظم فخر رکھے سلطانی ۔۔۔ روشن بخت بلند بہادر خاص رکن خاقانی
فلک رکاب عقاب علی دم اکارے کفرستانی ۔۔۔ مردانہ میدان اُتے ہے راوٹ رستم ثانی
تیغ تیز طی طوفان شکل مل فوج ڈبوے طغیانی ۔۔۔ ہن تابع تیں دا ورد ہے کل درانی درانی

ڈسن جبین تیڈے تے کل صفتاں رحمانی — رحم کرم انصاف عدالت فائدہ فیض رسانی
دولت صولت نال ہمیشہ بانہیں جند جوانی — روز بروز ڈیوے نت تیکوں فلک فتح مہمانی
اوج کنوں ڈکھ موج خضر کوں گنج ڈیوی ارزانی — مسند منصب نسب تسل تھی بنا بہاول خانی

میں مسکین دعا گوتے کر فاتوں فیض رسانی
ہر دم کرے دعائیں تیکوں لطف علی سیرانی

اس کے برعکس شاہ لطیف، کا قصیدہ بے نفسی کا آئینہ دار ہے۔ نواب صاحب چونکہ سندھ سے ہی یہاں آئے تھے اور انہیں اہل صفا اور بزرگان دین سے خاص عقیدت تھی اس لئے شاہ لطیف نے اپنے تعلق خاطر کو قائم رکھتے ہوئے ایک والئی ریاست کے لئے کلمۂ خیر کہنے میں کوئی برائی محسوس نہ کی۔ ان کے قصیدے کے چند شعر یہ ہیں۔

جو پنجتن جو بادشاہ سونی بخت بہاولخان جا
عالم پھلے بخت کے، اوھو بخت سندھو ھمراہ
بخت تھئو بلند آھے بئی سب بخت سیاہ
پنجتن تھئیے بخت کھو کرے پشت پناہ
پنجتن تھئیے بخت جو سرتے ورو کاہ
توساں فضل فتاح ٿئو لاتٔ سید لطیف چیو

خواجہ غلام فرید کی قصیدہ گوئی کا پس منظر بھی اسی قسم کا ہے۔ نواب صادق محمد خان رابع کی ان سے دلی عقیدت اور ارادتِ خاص کا حال

تپچھلے صفحات میں بیان ہو چکا ہے۔ غالباً اسی ارادت مندی نے ان کو اپنے مُرید کے لیے قصیدہ کہنے پر آمادہ کیا۔ علاوہ ازیں یہ دور وہ تھا جب ریاست میں انگریزی لیجنسی کا انتظام تھا اور نواب صاحب ابھی مسند نشین نہیں ہوئے تھے خواجہ صاحب کو یہ صورت حالات دل سے ناپسند تھی۔ وہ چاہتے تھے کہ ریاست میں جلد سے جلد خود مختار اسلامی حکومت قائم ہو اور نواب بہاولپور ایک اسلامی فرمانروا کی حیثیت سے خلقِ خدا کی صحیح خدمت کا حق ادا کریں۔ چنانچہ اسی جذبہ کے تحت انہوں نے قصیدہ کہا۔ یہ قصیدہ ان کا پہلا اور آخری قصیدہ معلوم ہوتا ہے۔ کیونکہ اس کے علاوہ دیوان فرید میں جو نواب صاحب بہاولپور کے ایما پر ہی مرتب ہو کر شائع کیا گیا تھا کوئی اور قصیدہ نہیں ملتا۔ یہ قصیدہ جو دلی جذبات کا آئینہ دار ہے، دعائیہ کلمات سے شروع ہوتا ہے اور دعا پر ہی ختم ہو جاتا ہے۔ درمیانی شعروں میں پہلے انگریزی طرز حکومت سے بیزاری ظاہر کی گئی ہے اور اس کے بعد کچھ حوصلہ افزا اور ہمت بخش خیالات پیش کیے گئے ہیں تاکہ مستقبل کا حکمران انہیں پیش نظر رکھ کر اپنے لئے ایک بہترین راہِ عمل متعین کر سکے۔ قصیدے کے صرف سات بند ہیں جو مع ترجمہ یہاں درج کیے جاتے ہیں۔

صبح صادق خان صاحبی ملڑے پا سہرے گانڑے گہنے

(اے صبح صادق خان (یہ صادق محمد خان رابع کا لقب تھا) خدا کرے تو سہرے اور گہنے پہن کر تخت حکومت کو پوری طرح زینت بخشے)

ہیوں پھلوں سیجھ سہاتوں بخت نے تخت کوں جوڑ جھکاتوں

اپنے ملک کوں آپ وساتوں　　پٹ انگریزی تھانے

(اے صادق محمد خان خوشی خوشی سے اپنی پھولوں کی سیج کو سہا اور اپنے بخت اور تخت کو صحیح معنی میں زیب دے۔ اپنے ملک کو بہ اختیاراتِ کامل خود آباد کر اور انگریزی چوکیاں اور تھانے خالی کرالے۔)

سن اقبال تیڈا پے ڈر دے　　راجے دہشت کھا کر مردے
میر نواب تھئے آبر دے　　بے زر مفت وکانے

(تیرے تیرِ اقبال کا وہ عروج ہے کہ دنیا خوف کھاتی ہے۔ راجہ دہشت کھا کر مر رہے ہیں اور امیر و نواب تیرے در کے بے دام غلام ہیں)

پیر فقیر تیکوں سب چہندے　　صوبیدار ملازم رہندے
گرداگرد کچہری بہندے　　افلاطون سیانے

(اے صادق محمد خان ملک کے پیر و فقیر سب تجھے دوست رکھتے ہیں۔ اور ملک کے صوبیدار تک تیرے ملازم ہیں اور افلاطون جیسے حکیم و فلسفی تیرے درباری ہو کر بیٹھتے ہیں۔)

فیض تیڈے دے جگ وچ قصے　　زالاں مرد گئے گھن حصے
ننگر ننگڑے پوڈھڑے لسے　　نندھڑے بال ایانے

(تیرے فیض اور بخشش کی دنیا میں شہرت ہے۔ زن و مرد۔ کمزور و طاقتور اور جوان و پیر سب تجھ سے فیضیاب ہو رہے ہیں۔)

خوب ہنڈ ائیں جند جوانی　　ہر دم کول وسیں دل جانی
یار پیارا یوسف ثانی　　ناز تیڈے من بھانے

(تو اپنی جوانی کو خوب لطف سے بسر کر اور اے دل جانی ہمارے نزدیک رہ۔ اے پیارے دوست اور یوسفِ ثانی تیرے ناز و انداز دل کو بھا گئے ہیں۔)

کرے فرید ہمیش دعائیں　　سانول جیویں چر جگ تائیں
تیڈے ساڈے سوہنا سائیں　　لگڑے نینہہ پورانڑے

(اے صادق! فرید ہمیشہ دعا کرتا ہے۔ اے سانولے دوست تو ہمیشہ جیتا رہ کیونکہ تیرے اور ہمارے دیرینہ تعلقات محبت وابستہ ہیں۔)

کافیاں
اور
اُن کا منظوم ترجمہ

کافی نمبر ۱

اوتھ درد منداں دے دیرے
جتھ کرڑ کنڈا بوئی ڈھیرے

اے اُچے ٹبڑے عالی
ہن مشتاقاں دے والی

اے سوہنی گکڑی والی
بیا کون قدم راتھ پھیرے

کھپ کھاراں تے لئی لانڑیں
تھل ٹبے ڈہر ٹکانڑیں

سٹھ پھوگ ہوں من بھانڑیں
ہر بھٹ بھٹ نال بسیرے

مڑ بھوکاں تے تڑ تاڈے
واہ تکیہ گاہ اساڈے

رس پھبڑے کھیلاں کھاڈے
ہن ہووے کون نکھیڑے

ٹپ ٹوبھے باہیں سوہندے
جی ہر ویلے پیا لوہندے

وچ چٹکے دل توں موہندے
ہے ہر دم ہوون تیڑے

جھڑ گاجاں بجلیاں بادل
کیا چٹڑے گورے ساول

ہک سانول کرے او پاہل ۔۔۔ لڈ ہوت وسم آ ویڑھے

ولھ گگڑیاں ریہڑ کچریاں ۔۔۔ کئی سبز متیرے کھکڑیاں
کئی گدریاں پیلیاں گگڑپاہل ۔۔۔ سر روہی سوہندے سہرے

خوش قطرن عطروں بھنڑی ۔۔۔ گرہ لائی ساوی سنڑی
کھا ساگ پوسی دی پھنڑی ۔۔۔ رنبھ ویندے وقت سکیڑے

دل ہر دیہلے پئی تانگھے ۔۔۔ ونج ویکھاں مال دے لانگھے
گینئں بکریاں بھیڈاں چا نگھے ۔۔۔ لنگھ پوندم قدم اگیرے

سنج واہ اساڈیاں جھوکاں ۔۔۔ سن کملے کردے ٹوکاں
کجھ خبر نہیں انہاں لوکاں ۔۔۔ دل پھٹڑے سخت اویڑے

بٹھ شہر بزار عمارت ۔۔۔ بیواہی برہوں بشارت
پئے تک عشق اشارت ۔۔۔ چھڈ جھگڑے کوڑے جھیڑے

تھیاں روہی مینگھ ملہاراں ۔۔۔ گل گل گلزار بہاراں
ورچ سوہندیاں گھنڈ تواراں ۔۔۔ ہر ٹوبھے چھانگاں چھیڑے

سو ککرے کنڈڑے کاٹھیاں
لکھ ڈونگر اوکھیاں گھاٹیاں
سب ڈنگڑے وٹڑے چاٹیاں
جتھ تھیوم فریدؔ وہیرے

اردو ترجمہ

قیامِ عشاق

دردمند دل کا ہے قیام وہاں
خار و خس اور جھاڑیاں ہیں جہاں

اونچے اونچے یہ ٹیلے ہمت زا   بھوری بھوری یہ ریت جلوہ نما
عاشقانِ گرفتہ دل کے رسوا
کس کی ہمت جو کوئی آئے یہاں

جھاڑیاں بوٹیاں خس و خاشاک   رشکِ گلزار غیرتِ افلاک
ہم ہیں میدان ہیں تھل ہے وحشتناک
اور ہر ٹیلے پر ہے اپنا مکان

جوہڑوں میں ہے زیست محوِ خرام   گھاٹیوں میں رواں ہے عیشِ دوام
واہ کیا خوب ہے یہ جائے قیام
چھوڑ کر اب ہم اس کو جائیں کہاں

ریت کے ٹیلے سر اٹھائے ہوئے   خشک تالاب دھوپ کھائے ہوئے
یہ مناظر ہیں دل لبھائے ہوئے
کسی لمحے نہ ہوں نظر سے نہاں

گھر کے آئی ہے آسماں پہ گھٹا   بجلیوں نے کیا ہے حشر بپا
شوقِ دیدار آجکل ہے سوا

کاش ایسے میں آئے دوست یہاں

بیل بوٹوں کی جا بجا ہے قطار   کچریوں پر بھی آرہی ہے بہار

ہر طرف رنگ ہر طرف ہے نکھار

گویا وہی لمبے رشکِ باغِ جناں

خس میں ڈوبی ہوئی ہے آب و ہوا   عطر آمیز ہے یہاں کی فضا

ساگ بھی دے رہا ہے ہمکو مزا

وقت اچھا گذر رہا ہے یہاں

شوق کا کچھ نہیں ہے حد و حساب   گائے بھیڑوں کا کیا کہیں ہے جواب

حسرتِ دید میں ہے دل بیتاب

قدم اٹھتے ہیں مثلِ ابرِ رواں

ریگِ صحرا یہ ابر گوہر بار   ہر طرف پھول ہر طرف گلزار

گھنٹیوں کی یہ نقرئی جھنکار

اُف یہ دل کش مویشیوں کا سماں

اپنا ویرانیوں میں ہے مسکن   نام دھرتے ہیں عقل کے دشمن

بے سبب ہو رہے ہیں طعنہ زن

یہ حقیقت میں ہیں بہت نادان

شہر کی رونقوں کو آگ لگے   ساز و سامان عشق سے ہے پرے

ہیں اشاراتِ عشق ہم کو بھلے

چھوڑ جھگڑے فساد کا داماں

سینکڑوں کنکر اور ہیں روڑے   کچھ ہیں چھوٹے تو کچھ بہت ٹیڑھے
اونچے نیچے یہاں کے ہیں رستے
پاؤں رکھے فریدؔ کوئی کہاں

کافی نمبر ۲

آچھوں رل یار۔ پیلوں پکیاں نی وے

کئی بگڑیاں، کئی ساویاں پیلیاں   کئی بھوریاں کئی پھکڑیاں نیلیاں
کئی اودیاں گلنار   کٹویاں رتیاں نی وے

پار تھئی ہے رشک ارم دی   سک سڑ گئی جڑھ ڈکھ تے غم دی
ہر جا باغ بہار   ساکھاں چکھیاں نی وے

پیلوں ڈیلھیاں ندیاں گلزاراں   کہیں گل ٹوریاں کہیں سر کھاریاں
کئی لا بیٹھیاں بار   بھر بھر پچھیاں نی وے

جال جلوٹیں بختی آبادی   پل پل خوشیاں دم دم شادی
لوکی سہنس ھزار   گل تے بھکیاں نی وے

حوریاں پریاں ٹولے ٹولے   حسن دیاں ہیلاں برہوں دے جھولے
راتیں ٹھڈیاں ٹھار   گڑ ئلیں تتیاں نی وے

رکھدے ناز حسن پرور دے ابرو تیغ تے تیر نظر دے
تیز تکھے ہتھیار ڈِلیاں پھٹیاں نی وے

کئی ڈیون اَن نال برابر کئی گھن آون ڈیڈھے کر کر
کئی ویچن بازار تے تلیاں تکیاں نی وے

کئی دُھپ وِچ چُنڈیاں رنہدیاں کئی گھن چھان چھنوندے پہندیاں
کئی چُن چُن پیاں ہار ہٹیاں تھکیاں نی وے

ایڈوں عشوے غمزے نخرے اوڈوں یار خرایتی بکرے
کمن کان تنبار رانداں رسیاں نی وے

پیلوں چندیں بوچھن لیراں چولا دی تھیا لیر کتیراں
گلڑے کرن پچار سینگیاں سکیاں نی وے

آیاں پیلوں چنن دے سانگے اوڑک تھیاں فریدن دلگے
چھوڑ آرام قرار ہکیاں بکیاں نی وے

آ چنیں یار پک گئے پیلو

ہیں سفید اور سبز اور پیلے کئی بھورے ہیں اور کئی نیلے
رنگ اودا کسی کا ہے گلنار
دودھیا سُرخ سب کے سب دلجو
دشت بھی غیرتِ ارم ہے آج خشک بنیادِ رنج و غم ہے آج
چپّے چپّے ہیں ہنس رہی ہے بہار
چکھ کے تو دیکھ تازہ پھل کو تو
پیلو ڈیلھوں سے دشت ہے گلزار ٹوکری سر پہ یا گلے کا ہار
لئے بیٹھی ہیں میوے کا انبار
کر رہی ہیں پھلوں سے وہ جادو
اب تو جنگل میں ہو گیا منگل ہے ان آبادیوں کی وجہ یہ پھل
چُننے والوں کی ہر طرف ہے قطار
جھگیاں ہیں نگاہ میں ہر سُو
اُف یہ دوشیزگانِ حور جمال ہائے بادِ سحر کی دھیمی چال
سرد راتوں کا یہ حسین نکھار
دن کو رہی ہیں گرم کار ہے تُو
اللہ اللہ یہ حُسن کی تاثیر تیغ ابرو کی اور نظر کا تیر

تیز تیکھے ہیں سب کے سب ہتھیار
پارہ پارہ ہو دل تو کیا ہو رفو

کہیں ہموزن ہے یہ غلے کا   کہیں دیتی ہیں جنس سے ڈیوڑھا
پیلو بکتے ہیں اب سرِ بازار
تولتی ہیں ادا سے یہ خوشرو

کچھ تو صحرا میں سہہ رہی ہیں دھوپ   سائے میں کچھ بچاری ہیں روپ
پیلو چُن چُن کے ہو گئیں بے زار
یہ تھکن سوکھے ہونٹ خشک گُلو

ناز نخروں میں ہیں یہ سب مشّاق   کیسے قربانیوں کے ہیں عشاق
حسن والوں کی فوج ہے تیار
دلفریب ان کے کھیل کا جادو

کام میں اوڑھنی کا ہوش نہیں   چوڑیاں ان کی تار تار ہوئیں
نکتہ چیں ہو رہے ہیں رشتہ دار
اور ہمجولیوں میں ہے تھُو تھُو

پیلو چُننے کو آئی تھیں یہ ضرور   اب ہیں مثلِ فریدؔ ہوش سے دور
چھٹ گئے ہیں سکون و صبر و قرار
جیسے وارفتہ ہو کوئی آہو

کافی نمبر ۳

وچ روہی دے رہندیاں — نازک نازو جٹیاں

رائیں کرن شکار دلیندے — ڈیہاں ووڑن مٹیاں

گجھڑے نیر چپلاون کاری — سے سے دلڑیاں پھٹیاں

کر کر درد مندا ں کوں زخمی — ہے ہے بدھن نہ پٹیاں

چھیڑن بھیڈاں بکریاں گائیں — ویلے گابے کٹیاں

کئی مسکین مسافر بھاتھے — چوڑ رکیتونے ترٹیاں

دھوئیں دار فقیر تھیوسے — نخرو ڈانیاں سٹیاں

ہیوں دلبر دے کترے دردے — پرہوں پیاں گل گھٹیاں

ہو نجھ فرید مزید ہمیشہ

اج کلھ خوشیاں گھٹیاں

اردو

حسینانِ روہی

روہی دیس کی رہنے والی
نازک نازک دوشیزائیں
دن کو بلوئیں چھاچھ کے مٹکے
شب کو شکاری بھیس بن آئیں
سو سو دِل ہو جائیں زخمی
ایسے کاری تیر چلائیں
کر کے زخمی اہلِ دِل کو
مرہم کا پھاہا نہ لگائیں
بھولے بھٹکے سینکڑوں راہی
چاک کیے پھرتے ہیں قبائیں
مل کر خاک بدن پر ہم نے
چھوڑیں فخر کی ساری ادائیں
ہم ہیں یار کے در کے کتے
بھانے لگی ہیں اس کی ادائیں
اُڑے فریدؔ آرام کے لمحے
غم کی چلیں وہ تیز ہوائیں

کافی نمبر ۱۴۳

رتھ ڈِسیمیں ڈِسیمیں ٹور

میڈا دستہ نرم کرور دا — متاں ونگیں بگم ٹکور
رتھ تے بہندی ڈرگ نہ سہندی — ہِم طبع کم زور
روز ازل دی پاتم گل وچ — برہوں تیڈے دی ڈور
شالا مولھ سلامت نیواں — رہ وچ لڑدن چور
جیکر رتھ بیٹھیں تھک پوساں — گھوڑا گھنساں پور
سو کھا تیز لگام دا کولا — ناں اوکھا سر زور
رانجھن تے میں جوڑے کوں جوڑوں — جوڑ جوڑیندا جوڑ
رسک تے طلب ملن دی سینے — روز نواں ہم شور
پندھ اڑانگے دلڑی تانگھے — جلد پجاویں توڑ

میں نے یار فرید منیسوں
رل رل شہر بھنبھور

اردو

رتھ چلا دھیرے دھیرے اے رتھ بان

چوڑیاں میری نرم و نازک ہیں — دیکھ ان کا کہیں نہ ہو نقصان

ناتوانی پہ ایسے ہچکولے — جان ہو جائے گی مری ہلکان

ہر ازل سے گلے میں عشق کا طوق — تیرے عاشق کی ہے یہی پہچان

راہزن ہر قدم پہ ہیں یارب — رکھنا محفوظ عشق کا سامان

لونگی میں بھورے رنگ کا گھوڑا — رتھ میں ہو جائیگی جو مجھکو تکان

تیز رو ہو مگر نہ ہو سرکش — بیٹھنا جس پہ ہو بہت آسان

کیا خدا نے ملائی ہے جوڑی — یار اور میں دو قالب یک جان

جستجوئے حبیب تازہ ہے — لمحہ شوق ہے نیا ہر آن

راہ دشوار اور دل بیتاب — کرد ے یارب یہ مشکلیں آسان

ہوگا یار اور فرید ہوگا بھنبھور

خوب نکلیں گے دل کے سب ارمان

کافی نمبر ۵

تتی رو رو واٹ نہاراں
کڈیں ساؤل موڑ مہاراں

جیں کارن سو سختی جھاگی
پھراں ڈوہاگی ویس براگی
جیندیں ڈیکھاں ساؤل ساگی
تھیواں باغ بہار

یار بروچل وِسم سو لڑا
جیندیں سانگے مانیم تھلڑا
خان پنلڑا نازک کلہڑا
توں سنگ چانگے چاراں

جیں ڈینہہ یار اساں توں نکھڑے
مینہدی روپ ڈکھلائے پھکڑے
ڈسدے سرخی دے رنگ بکھڑے
وِگھریاں کجل دیاں دھاراں

مَن مَن منّتاں پیر مناواں
مُلا گول تعویذ لکھاواں
سبڑ سبڑ جو سی پھالاں پاواں
کردی سونڑ ھزاراں

خواجے پیر دے ڈیساں چھنّے　　لیہے ڈینہہ انھائیں بھنّے
جیندیاں سبھ دل کیتیاں منّے　　وسّم سدا گھر باراں

بندڑے نال نہ کرسیں مندڑا　　توڑیں کوجھا کملا گندڑا
لٹک سہائیں صحن سوہندڑا　　یُوں یُوں توُں جندواراں

چھوڑ فریدے نہ یار دا دامن　　جیں جی کیتا جرڑ کر کامن
ڈوہاں جہانیاں ساڈا مامن　　کینویں دلوں وساراں

اردو

کبھی سانول ادھر بھی موڑ مہار

راہ تکتی ہے کب سے عاشقِ زار
کبھی سانول اِدہر بھی موڑ مہار

جس کی خاطر اُٹھائے رنج و محن
جس کے کارن بنی میں بیراگن
جس کے دیدار کی ہے مجھ کو لگن
اب وہ آئے تو دل ہو باغ و بہار

کاش محبوب میرے پاس آئے
دشت میں اب نہ خاک چھنوائے
شامِ فرقت کے دُور ہوں سائے
میں ہوں اس کی شریکِ کاروبار

داغ فرقت کا تونے جب سے دیا
رنگ مہندی کا پڑ گیا پھیکا
سُرخیٔ لب اُڑی ہے مِثل ہوا
کاجل آنکھوں کا ہو گیا بیکار

منتیں مانیں خانقاہ گئی
عاملوں سے میں نقش بھی لائی
جو تشیوں نے فال بھی دیکھی
ٹوٹکے بھی کیے ہیں میں نے ہزار

پیر خواجہ کا دوں گی میں چھنّہ
منتیں سب بڑھاؤں گی مولا
قول اپنا کروں گی میں پورا

کاش آئے یہاں وہ جانِ بہار

عشق میں تیرے مبتلا ہوں میں　　لاکھ بد شکل و بے نوا ہوں میں

تجھ پہ سو جان سے فدا ہوں میں
مجھ پہ کر لطف کی نظر اک بار

اس نے جادو کیا ہے مجھ پہ شدید　　چھوڑ دوں دامن اس کا کیسے فرید

اس کے قبضے میں دو جہاں کی کلید
کس طرح دل ہو اس سے اب بیزار

کافی نمبر ۶

مِل مہینوا لا - مِل مہینوال
ہر دل میں ہے تیڈڑی بھال

روزِ ازل دی سختی ماری ڈِتری مول نہ قسمت واری
ماہیو وِیر نہ لہم سنبھال

فکر فراق تے مونجھ مونجھاری یاری لاکر مٹھڑی ہاری
ڈِسدم وصل وصال محال

روندیں رڑدیں کوُ کاں کردی آہیں بھردی جُھکھ جُھکھ مردی
عشق اولڑا جی جنجال

زورے تورے حسن دے مانٹے سارے ہار سنگار وہانٹے
آئی اوڑک سولاں جال

ناز نزاکت نوکاں نخرے سبھوں سکھ سُہاگ دے بخرے
ساڈے پوکھڑے کوجھڑا حال

خویش قبیلہ دشمن سارا ہر کوئی مارم جانڑ وچارا
برہوں اُویڑا اُولٹی چال

ویڑھے یار فرید نہ آیا گل گیا جوبن مفت اجایا
ڈُھنڑے ڈُنڈ تے چِرٹے وال

اردو

اے مہینوال

اے مہینوال اے بہارِ جمال
آ کہ ہر دل میں ہے تیرا ہی خیال

میں ازل سے ہوں شوق کی ماری　　کیا شکایت کروں گی قسمت کی
کوئی کرتا نہیں ہے پرسشِ حال

غمِ ہجراں سے کتنی چور ہوں میں　　عشق میں راحتوں سے دور ہوں میں
وصلِ محبوب ہو گیا ہے محال

رات دن آہ آہ کرتی ہوں　　حال اپنا تباہ کرتی ہوں
عشق کا پڑ گیا ہے کیا جنجال

نہ جوانی رہی نہ حسن کا ناز　　سب ہوئے ایک دن سپر انداز
غم کا پھیلا دیا ہے عشق نے جال

ناز و انداز ہیں نہ اب نخرے　　ختم سارے سہاگ کے قصے
ہے طبیعت غم و الم سے نڈھال

خویش و احباب درپئے آزار　　جانتے ہیں یہ سب مجھے لاچار
عشق کی کسقدر ہے الٹی چال

اس کو آنا تھا اور نہ آیا فرید　　سارا جوبن یونہی گنوایا فرید
کیا پیری نے آخر استقبال

کافی نمبر ۷

تُوں بن حضرت یار
ہر دم پھراں حیرانی

•

ماہی باجھوں سول گھنیڑے　　جیونڑ ہے بے کار ۴
جانڑ دل دا جانی
دلبر جیہاں ہور نہ کوئی　　خوبی دا سردار
صورت وچ لاثانی
پنل چھڈ کے کیچ سدھایا　　کیتس زار نزار
رو رو قیوم دیوانی
عشق اویڑا پیش پیوسے　　دل نوں دار مدار ۴
تن من سو سو کانی
درد فرید ہے چیز مہانگی　　تھیندے وِنج وپار
جندڑی کر قربانی

اردو

تیرے بغیر

اے سراپا بہار تیرے بغیر

ہر گھڑی ہے مجھے پریشانی

روز افزوں ہیں درد و کرب والم زندگی کیا ہے مستقل آزار

واقفِ حالِ غم ہے دل جانی

ایسا دلبر کہاں سے لاؤں میں خوبیوں میں حسینوں کا سردار

شکل و صورت میں جو ہے لاثانی

چل دیا دوست چھوڑ کر مجھ کو ہو گیا حال میرا زار و نزار

ہو گئی روتے روتے دیوانی

رنج و غم سے ہے چور چور بدن ہے فقط ایک دل پہ دار و مدار

عشق میں کیا کہوں گراں جانی

بیش قیمت ہے میرا درد فرید کوئی سستا نہیں ہے یہ بیوپار

اس میں ہوتی ہے جاں کی قربانی

کافی نمبر ۸

سن دو سہیلی سُگھڑ سیانی

برہوں دے پندھڑے سخت بعید

ناکل میکوں تیغ قضا دی ناتقدیر دے تیر دغا دی
کیتم دوست دی دید شہید

جے ڈینہہ بھلڑے متروی بھلڑے قسمت جوڑے جوڑ کللڑے
یار شدید تے بخت عنید

رووَن پُٹن کوں سمجھوں شادی سُنج بر جھر جھنگ ڈسم آبادی
عشرہ محرم سادڑی عید

سو سو چھانگاں لکھ لکھ چھیڑو دو تھڑے دی وہ ڈیون پندھیڑو
روہی تھئی آباد جدید

جند اسیرے جور و جفا دی دلڑی قیدی کرب و بلا دی
ڈسم رقیب یزید پلید

ست خرقہ بھٹ گھت سجادہ جامۂ جاں شو پاک بہ بادہ
کردم پیرِ مغاں تاکید

سانول یار دے ناز نگہ دے مارو چال تے خال سیہ دے
تھیوسے مفت فرید خرید

اردو

سُن اے سہیلی

سُن اے دانا، سگرڑ سہیلی سُن
راہِ الفت کی ہے بہت ہی بعید

کیا خبر مجھ کو کیا ہے تیغ قضا   کہتے ہیں کسکو لوگ تیرِ دغا
نگہِ یار نے کیا ہے شہید

دن بھلے ہوں تو دوست بھی ہوں بھلے   کیفیت یہ ہے اب تو قسمت سے
دوست ظالم ہے اور بخت عنید

آہ و شیون مرے لئے شادی   اور ویرانیاں ہیں آبادی
دن محرم کے ہیں ہماری عید

لاکھ چرولا ہے، سینکڑوں ریوڑ   ابر باراں کی آرہی ہے خبر
روہی آباد ہے بہ طرزِ جدید

زندگی ہے اسیرِ جور و جفا   دل ہے یوں مبتلائے کرب و بلا
جیسے حق کے مقابلے میں یزید

پھینک خرقہ جلا دے سجادہ   جامۂ جاں پہ پھیر دے بادہ
مجھ کو مرشد نے کی ہے یہ تاکید

سانولے یار کی نگاہوں کا   خالِ رُخ اور مست چاتوں کا
ہو گیا معنت میں غلام فرید

کافی نمبر ۹

الف ہکو ہم بس وے میاں جی

ہور کمائی مول نہ بھائی — الف گیوم دل کھس وے میاں جی

بے تے دی بئی گل نہ کائی — الف کیتم بے وس وے میاں جی

ٹھپ رکھ فقہ اصول دے مسلے — باب بہ ہوندا ڈس وے میاں جی

جے نال سبق پڑھوں دا ڈتڑو — اج کل ولیاں نس وے میاں جی

جے کر لگڑو چاٹ پڑھوں دی — جاواں کوں ڈیسیں ڈس وے میاں جی

پڑھوں سکھیں تے پڑھوں سکھاویں — ہئی شاباس شاباس وے میاں جی

جیندیں موئیں ہک یار دے رہسوں — وسری ہور ہوس وے میاں جی

منتر پریت دا پھوک شکاریں — لگڑین ہم آلس وے میاں جی

الفت زردی، گھردی وردی — نا رہ گئی ہک خس وے میاں جی

رانجھن میڈا، میں رانجھن دی — کھیڑیاں دے مونہہ بھس وے میاں جی

ست گھر بار تے یار وسیساں — بدلیں کیتی کس وے میاں جی

علم عمل بھل ویسی جے کر — عشق پیوئی کن رس وے میاں جی

اوڑک عشق اندر جند ڈیسوں — ناسمجھیں کھل ہس وے میاں جی

نینہہ کڈو کڑاں پیوسے پچھڑے — ناہئی قلم تے مس وے میاں جی

نا اج کل دی یار دے دل دی — روز ازل دی ہس وے میاں جی

عشقوں مول فرید نہ پھرسوں
روتہ نویں ہم چس وے میاں جی

اردو

اک الف ہی بہت ہے یا قبلہ

نہیں رغبت کسی کہانی سے — دل الف نے اڑا لیا قبلہ
اس الف نے کیا وہ خود رفتہ — نہیں بے تے کا کچھ پتا قبلہ
اب اصول و فقہ کو رہنے دیں — درس دیں مجھ کو عشق کا قبلہ
نہ دیا گر سبق محبت کا — ایک دن بھاگ جاؤں گا قبلہ
چاٹ خود لگ گئی تو کر دیں گے — نسل کو عشق آشنا قبلہ
کیجیے بھی سکھایئے بھی عشق — آفریں قبلہ! مرحبا قبلہ
جیتے جی اس کے مر کے بھی اس کے — حرص ہے کچھ نہ اب ہوا قبلہ
ہے طبیعت نڈھال سی اپنی — پڑھیے منتر پریم کا قبلہ
عشق میں زر نہ گھر نہ بر کی طلب — کوئی ارماں نہیں رہا قبلہ
میں ہوں محبوب کا مرا محبوب — خاک لوگوں کے منہ میں یا قبلہ
چھوڑ کر گھر بساؤں گا صحرا — چھا گئی ہر طرف گھٹا قبلہ
عمل و علم بھول جائیں گے — عشق سے ہو کے آشنا قبلہ
رہِ الفت میں جان جائے گی — کھیل اس کو نہ جاننا قبلہ
عشق اس وقت سے نصیب میں ہے — نہ سیاہی نہ خامہ تھا قبلہ
صرف دو چار دن کی بات نہیں — اس پہ اول سے ہوں فدا قبلہ

منہ نہ موڑیں گے عاشقی سے فریدؔ
لطف ہر روز ہے نیا قبلہ

کافی نمبر ۱

ناصح ناہی ناہی مانع
عشق اساڈا دین ایمان

کنت کنزاً عشق گواہی پہلوں حب خود ذات کوں آہی
جیں سانگے نبیا جگ جہان

عشق ہے ہادی پریم نگر دا عشق ہے رہبر راہ فقر دا
عشقوں حاصل ہے عرفان

مال عیال دی بٹھ گھٹ یاری دنیا عقبیٰ توں بھی عاری
بے سامانی ہے سامان

مذہب مشرب لامذہب دا ڈُب ہے سارے ارث عرب دا
شاہد درس حدیث قرآن

سکھ خلقت سٹ غیر دی علت ابن العربی دی رکھ ملت
آکھیوم سوہنے فخر جہان

غافل شاغل ناسی ذاکر صالح طالح مومن کافر
سب ہے نور قدیم دا شان

احد ادہی ہے احمد او ہے میم دے اولے دلڑی موہے
دھیان فرید رکھیں ہر آن

اردو

عشق

عشق سے ہمکو روک نہ واعظ
عشق ہمارا دین ایمان

کنتُ کنزاً عشق کا مظہر — حق نے پیا خود عشق کا ساغر
عشق بنائے ہر دو جہان

عشق ہے ہادی پریم نگر کا — عشق دکھائے فقر کا رستہ
عشق سے پایا ہے عرفان

مال عیال سے رشتہ توڑو — عقبیٰ کے بھی فکر کو چھوڑو
بے سامانی ہے سامان

مذہب مشرب لا مذہب کا — لُب ہے سارے ارث عرب کا
شاہد ہے درسِ قرآن

خلقت سیکھ مٹا سب علت — ابن العربی کی رکھ ملت
فخرِ جہاں کا ہے فرمان

غافل شاغل ناسی ذاکر — صالح طالح مومن کافر
سب ہے نور قدیم کی شان

احمد اور احد اک جلوہ — موہے دل کو میم کا پردہ
دھیان فرید لبے ہر آن

کافی نمبر ۱۱

دستوں پیر مغاں دے   پیتم عشق دا جام
وحدت کیتا غلبہ   بھُل گیا کفر اسلام
گذرے فرض فریضے   سنت کو بھی سلام
کشف حقیقی آئے   گئے اضغاث احلام
وحدت ذاتی سبھ دا   ہے آغاز انجام
تکھڑی تیغ نفی دی   غیر کیتا قتلام
باجھوں شغل حقیقی   ہیو کُل کوڑ تمام
کر توبہ اغیاروں   پھٹڑے برہوں پیام

تُرت فرید فریدوں
تھئی آزاد تمام

اردو

پیر مغاں کے ہاتھ سے میں نے
پی لیا بادۂ عشق کا جام
وحدت کا تھا اتنا غلبہ
بھول گیا کفر اور اسلام
کیسے فرض اور کیسی سنت
دُور سے اپنا سب کو سلام
کشفِ حقیقی جب سے ہوا ہے
خواب و توہم کا کیا کام
عرفانِ توحید باری
ہے یہی آغاز اور انجام
تیغ نفی کی تیز ہے کتنی
کر دیا سب کا قتلِ عام
شغلِ حقیقی شغل ہے سچا
اس کے سوا ہے جھوٹ تمام
شرک سے توبہ کر لو یارو
یہ ہے اللہ کا پیغام
بھول فرید اپنی ہستی بھی
کر آزادی کا اہتمام

کافی نمبر ۱۲

رسک ساڑے تانگ پچالے

وطن نہ دسرم رانجھن والے

ہجر فراق دا کوجھا قصہ ساہ مونجھائے تے ہاں ڈالے

راہ اوڑے لکھ لکھ وڑے ڈونگرڑ کالے پیریں چھالے

دلڑی جڈری ڈوکھڑیں اڑی کینویں ہوش حواس سنبھالے

جیندیں ڈیکھاں جھوک سجندی قادر بار نمانڑے ٹالے

عشق سونہاتاں میکوں بھجیاں درد! اندیشے!! روگ!!! کشالے!!!!

ہے سوہنے دی عادت اصلوں کوڑے تیچ، فریبی چالے

یار فرید نہ اترم دل توں

لطفوں بھالے، خواہ نہ بھالے

اردو

ساجن دیس کے ہم متوالے

سوزِ عشق ہے دید کے لالے
ساجن دیس کے ہم متوالے

راہِ عشق میں پیچ ہیں لاکھوں
کالے پربت پاؤں میں چھالے

ہجر و فراق کا قصّہ توبہ
سانس میں روگ جگر میں بھالے

دل بے تاب و تواں ہے غم میں
کیسے ہوش و حواس سنبھالے

زیست میں یار کا مسکن دیکھوں
مولا غم کے بار کو ٹالے

عشق نے بھیجیں یہ سوغاتیں
درد اندیشے روگ کسالے

ہے میرے محبوب کی عادت
چکر۔ جھوٹ اور حیلے حوالے

یار فرید نہ آترے دل سے
چشم کرم وہ ڈالے نہ ڈالے

کافی نمبر ۱۳

روندیں عمر نبھائی
یار دی خبر نہ کائی

بھاگ سہاگ سنگار ونجایم
ڈِ لوں وساریا ماہی

دُور گیا دل آیا ناہیں
مرساں کھا کر پھائی

عشق نہیں ہے نار غضب دی
چٹنگ چوانتی لائی

جوبن سارا رُوپ گنوایم
دردیں مار موسائی

فخر الدین سہل دے عشقوں
دم دم پیر سوائی

یار فرید نہ پایم پھیرا
گل گیوم مفت اجائی

اردو

ہائے دوست کی چشم نمائی

روتے روتے عمر گنوائی
بوئے حُسنِ یار نہ آئی
بھاگ سہاگ سنگار لُٹایا
ہائے دوست کی چشم نمائی
جا کر پھر محبوب نہ آیا
پھانسی لے لے گی سودائی
عشق نہیں ہے نار غضب ہے
سر سے پا تک آگ لگائی
عشق میں جوشِ حسن و جوانی
میں نے اک اک چیز لٹائی
عشق میں پیارے فخر الدین کے
ہر ہر لحظہ آگ سوائی

یار فرید نہ آیا پھر بھی
ہم نے زحمت لاکھ اُٹھائی

کافی نمبر ۱۴۱

سکھی کر لیو ہار سنگار سبھی　　سیّاں رل مل دھوم مچائی

گرجت بادرہ لسکت بجلی　　رُت ساونن ٹھیک سہائی

اغن پپیہے کرن پلا رے　　رس کوئل کُوک سنائی

ملک ملہیر دِ سایم مولی　　سب گُل پھل خشکی چھائی

رلمل سیّاں ڈیون مبارک　　مُد بھاگ سہاگ دی آئی

مُدتاں پچھے رانجھن ملیا　　رب اُجڑی جھوک وساتی

آکر کان دوارے دلبے　　سدھ بنسی پرم بجائی

سنج فرید نہ کر دل مونجھی
گل لاج پئے گل پائی

اردو

سکھیو کرلو ہار سنگھار

سکھیو کرلو ہار سنگھار اب
سیاں رَل مِل دھوم مچائی
بادل گرجے، بجلی کوندی
آئی ساون کی رُت آئی
اُن پپیہے بول رہے ہیں
کوئل نے بھی کُوک سنائی
ملک ملہیر بسایا رب نے
پھولوں پر بھی رونق آئی
شور مبارک باد ہے ہر سُو
بھاگ سہاگ کی ساعت آئی
بعدِ مدت رانجھن آیا
رب نے اُجڑی جھوک بسائی
آیا کرشن مراری آیا
جس نے پیار کی بین بجائی
فکر فرید ہے سب بے معنی
بات اسی نے سب کی بنائی

کافی نمبر ۱۵

مساگ ملیندیاں گذر گیا ڈینہہ سارا　　سنگار کریندیاں گذر گیا ڈینہہ سارا

کجلہ پاہم رکھ سرخی لایم　　کیتم یار وسارا

کانگ اڈیندیں عمر وہانی　　آیا نہ یار پیارا

روہ ڈونگر تے جنگل بیلا　　رولیم شوق آوارہ

ہکدم عیش دی سیجھ نہ مانڑیم　　بخت نہ ڈتڑم وارہ

پڑھ بسم اللہ گھولیم سرکوں　　چاتم عشق اجارا

رانجھن میڈا میں رانجھن دی　　روز ازل دا کارا

ہجر فرید النبی لائی

جل گیم مفت وچارا

اردو

انتظار

نکھار بھی لبِ دندان کا کرتے میں ہارا
سنگھار کرتے ہوئے دن گذر گیا سارا
لگایا آنکھ میں کاجل لبوں پہ سُرخی بھی
مگر نہ ہجر کا کوئی بھی ہو سکا چارا
تمام عمر کٹی کوّے ہانکتے اپنی
نہ آیا پھر بھی مری سمت میرا مہ پارا
کبھی پہاڑ، کبھی دشت اور کبھی روہی
کہاں کہاں نہ گیا لے کے شوق آوارہ
مرے نصیب میں اک پل نہ آئی عیش کی سیج
رہا میں ہجر زدہ ہجرِ یار کا مارا
دیا ہے سر بھی محبت میں پڑھ کے بسم اللہ
ہمارے دم سے محبت کا ہے بھرم سارا
یہ بات روزِ ازل سے لکھی ہے قسمت میں
کہ میں ہوں یار کا اور یار ہے مرا پیارا
فرید ہجر کی کچھ آگ اس طرح بھڑکی
کہ جل کے رہ گیا میں سوزِ عشق کا مارا

کافی نمبر ۱۶

کیا حال سناواں دل دا
کوئی محرم راز نہ ملدا

منہ دھوڑ مٹی سر پایم — سارا ننگ نموز ونجایم
کوئی پچھن نہ ویڑھے آیم — ہتھوں الٹا عالم کھلدا

آیا بار برہوں سر باری — لگی ہو ہو شہر خواری
روندیں عمر گذاریم ساری — ناں پایم ڈس منزل دا

دل یار کیتے کرلاوے — تڑ پھاوے تے غم کھاوے
ڈکھ پاوے سول نبھاوے — ایہو طور تیڈے بیدل دا

کئی سہنس طبیب کماون — سے پڑیاں جھول پلاون
میڈے دل دا بھید نہ پاون — پو وے فرق نہیں ہک تل دا

پنوں ہوت نہ کھڑ مو کلایا — چھڈ کلہڑی مونجھ سدھایا

سوہنے جانڑ پچھان رولایا   کوڑا عذر نبھایم گھلدا

سن لیلیٰ دھانہہ پکارے   تیڈا مجنوں زار نزارے
سوہنڑا یار تونڑے ہک وارے   کڈیں چا پردہ محمل دا

دل پریم نگر ڈوں تانگھے   جتھاں پینڈے سخت اڑانگے
نا راہ فرید نہ لانگھے   ہے پندھ بہوں مشکل دا

اردو

غمِ دل

حال کسکو سناؤں میں دل کا

محرمِ راز کون سائل کا

منہ میں خاک اور سر غبار آسا ننگ و ناموس سب گنوا بیٹھا

پوچھنے کو تو کوئی کیا آتا

سب نشانہ بناتے ہیں دِل کا

ہجر کا بوجھ آپڑا سر پر ہوئیں بد نامیاں شریکِ سفر

ہم نے کاٹی ہے عمر رد رد کر

نہیں پایا سراغ منزل کا

دل ہے ہجرِ حبیب سے ہلکان عشق نے کردیا ہے اب بیجان

جھیلتا ہے مصیبتیں ہر آن

اب ہے یہ حال تیرے بیدل کا

لاکھ آئے طبیب بہرِ قرار کوششیں ان کی سب ہوئیں بیکار

دل کا بھید ایک عقدۂ دشوار

فرق غم میں ہوا نہ اک تل کا

چلدیا اور کچھ کہا نہ سنا رہ گئی میں یہاں نِت تنہا

تیج کو بے لے سدھار گیا
نیند تھی یا تھا وار قاتل کا

تجھکو معلوم بھی ہے اے لیلیٰ کس مصیبت میں ہے ترا شیدا
ہر گھڑی آہ ہر گھڑی ہے بکا
اب تو پردہ اٹھا دے محمل کا

دل کو ہر دور میں ہے پریم کی چاہ سخت دشوار ہے مگر یہ راہ
اے فرید اپنا حال دل ہے تباہ
یہ سفر ہے بہت ہی مشکل کا

کافی نمبر ۱۷

تیرے بناں سانول بھوں — دلڑی اگ بے آس ہے
جندڑی جلے سینہ سڑے — سر چُور ہے تن ناس ہے

جیڑا غماں دے وات ہے — ہیہات ہے ہیہات ہے
ہک ڈُوکھ تتی دے ساتھ ہر — سُکھ دی نہ بُو نہ باس ہے

جیں ڈینہہ پنل گیا کیچ ول — سٹ سیجھ کھٹ رنگیں محل
جھاگاں جبل گھاٹیاں تے تھل — ہک مونجھ ہے بئی پیاس ہے

وسرے نہالی تول سب — پوپا تے بنیر بول سب
ہن سوز ہے یا سول سب — یا درد ہے یا یاس ہے

کیڈے فرید اج نج نسوں — جتھ رچھ تے باندر دی وسوں
ڈینہیں میں راکھس بھوں — سو غول لکھ نسناس ہے

اردو

فراقِ دوست

اے دوست تیرے ہجر میں — دل کس قدر بے آس ہے
سینہ الم سے ہے تپاں — سر چور ہے تن ناس ہے

دل مورد آفات ہے — ہیہات ہے ہیہات ہے
اک دکھ کہ اپنے ساتھ ہے — سکھ کی نہ بو نہ باس ہے

جب سے ہوا رخصت پنل — چھوٹے مہری اور محل
اب میں ہوں اور دشت و جبل — اک رنج اس پہ پیاس ہے

تو شنگ رضائی محو سب — زیور بھلے لگتے ہیں کب
اب ہم ہیں اور رنج و تعب — ہے درد یا پھر یاس ہے

جائیں فرید اب ہم کہاں — ریچھ اور بندر ہیں یہاں
ہیں ڈائنیں ہر سو رواں — شیطان ہے نسناس ہے

کافی نمبر ۱۸

درشن بن اکھیاں ترس رہیاں

یئے سُول سہاں سک ساگ سوا — سُکھ بٹر گیٔے خوشیاں راکھ تھیاں

جی جلدا سینے آگ لگی — دل بیکل ہنجڑوں ڈہلک پیاں

بٹھ سیجھ سڑی بٹھ توں تتی — گیاں سینگیاں مرنیاں ورسیاں

گل کو جھے کلنٹے خار چُبھن — تھئی چولی سالہوں سینس دھیاں

کئی لہر لوڑھے کئی روہ رولے — کئی بھردے بوٹے پیٹ لیاں

دن بیت گئے سُدھ بسر گئی — ساجن نے برائیاں جوڑ کیاں

ہے ناز تہیں اعراض منڈھوں — رکھ آس نہ تھئی غم داس میاں

بن یار فرید نہ عید ڈٹھم

کھل کھیڈاں ساریاں وسر گیاں

اردو

بے دید ہیں آنکھیں اشک فشاں

ہے ہجر کا مجھ پر بارِ گراں
سُکھ چین کہاں، آرام کہاں
اک آگ لگی ہے سینے میں
بے تاب ہے دل آنسو ہیں رواں
یہ سیج یہ توشک کیا معنیٰ
ساتھی ہے نہ کوئی دوست یہاں
چبھتے ہیں گلے میں کانٹے سے
ہے چولی کرتی کا بھی زیاں
کچھ دشت میں گم کچھ بحر میں غرق
کچھ خار و خس میں محوِ فغاں
دن بیت گئے سدھ بسر گئی
کیا خوب تھا ساجن لطف کناں
یہ ناز ہے یہ اعراض نہیں
رکھ آس نہ ہو غم داس میاں
سب کھیل تماشے بھول گئے
بن یار فریدؔ ہے عید کہاں

کافی نمبر ۱۹

جیون ڈینہہ اڈھائی وو یار
ست گھت نخرو ڈائی وو یار

کتھ او پینگھ پپل ملکانڑے ناز حُسن کتھ راج ہپانڑے
کتھ ما بھنڑیں بھائی وو یار
کتھ رانجھن کتھ کھیڑے بیڑے کتھ رہ گئے اوہ جھگڑے جھیڑے
کتھ چوچک دی جائی وو یار
کتھ او مکر فریب دا چالا کتھ وت جوگی مُندراں والا
پرم جڑی جیں لائی وو یار
ماہی منجھیاں ہیر سلیٹی عطروں بھنڑی مشک لپیٹی
گیئے سب جھوک لڈائی وو یار
جوبن ساتھی چار ڈہاں دا جھٹ پٹ ضعف پڑیپا آندا
کوڑی آس پرائی وو یار
ہے ہے ڈٹھڑی کہیں نہ وینڈی کجل مساگ تے سُرخی مہندی
سُرمہ سیندھ سلائی وو یار

موسم رُل پھر دل گھر آئی　　　ونجݨ نہ وقت نراس اجائی
آنوݨ دی کر کائی وو یار

کوڑی صحبت کوڑی سنگت　　　کوڑے نخرے کوڑی رنگت
تپ دُھوڑی ہُک چھائی وو یار

مچھلیں بنگیں لاسوں تاریں　　　چنجلیں گھنڈڑیں ہونگ نواریں
سبھوں راند رسائی وو یار

تھیاں سرسبز فرید دیاں جھوکاں　　　تھروں سبز تھیاں وَل سوکاں
بخشیں واگ ولائی وو یار

اردو

بے ثباتیٔ دنیا

زندگانی کے ہیں دن دوپہر بیتی جائی یارو
چھوڑ دو فخر کرو ترک بڑائی یارو

اب وہ ٹھاٹھ نہ پیلپ ہے نہ کوئی جھولا حسن کا ناز کہاں راج کہاں آیا کا
نہ کہیں ماں ہے نہ بہنیں ہیں نہ بھائی یارو

اب نہ رانجھا ہے نہ رانجھا کے وہ کنبے والے جتنے جھگڑے تھے پڑے وقت کے ان پہ تالے
اب جو چپ ہے نہ چوچک کی وہ جائی یارو

بھیس بدلے ہوئے وہ عشق کا روگی ہے کہاں بالیاں کان میں پہنے ہوئے جوگی ہے کہاں
جس نے اک آگ محبت کی لگائی یارو

نہ وہ رانجھا ہے نہ بھینسوں کا کہیں اس کی نشان عطر اور مشک میں ڈوبی ہوئی وہ ہیر کہاں
لے گئے سب جسے گھڑی موت کی آئی یارو

چار دن کا ہے یہ جوبن یہ جوانی کی بہار دیکھتے دیکھتے ہو جاتے ہیں پیری کا شکار
جھوٹ ہے جھوٹ ہر آس پرائی یارو

اف جوانی کو کسی نے بھی نہ جاتے دیکھا ہائے وہ غازہ وہ کاجل وہ دنداسہ وہ حنا
اب سیندور نہ سرمہ نہ سلائی یارو

لوٹ کر پھر وہی ایام زمانہ آئے وقت باقی جو بچا ہے وہ نہ جانے پائے
اب کسی طور ہو تدبیر رسائی یارو

جھوٹی صحبت ہے زمانہ کی تو جھوٹی سنگت   جھوٹے انداز و ادا اور ہے جھوٹی رنگت

خاکِ یکمشت ہے یہ ساری خدائی یارو

یہ دھنک ماہی رنگیں کی طرح ابر کا جوش   گائے بھینسوں کی صدائیں یہ گڈریوں کا خروش

چھاؤنی رقص و ترنم کی ہے چھائی یارو

ریگزاروں میں بہار آگئی ڈیروں پہ فرید   خشک ٹوبوں کیلئے نشو و نما کی ہے نوید

پھر سے اللہ نے تقدیر جگائی یارو

کافی نمبر ۲۰

جگ وہم خیال تے خوابے
سبھ صورت نقش بر آبے

جے پوچھدیں حال حقیقت
سُن سمجھ اتے رکھ عبرت

جیویں بحر محیط ہے وحدت
کل کثرت شکل حبابے

نہیں اصلوں اصل دوئیدا
خود جان ہے نسل دوئیدا

گیا پھوکا نکل دوئی دا
ول اوہی آب د آبے

نہ کافی جان کفایہ
نہ ہادی سمجھ ھدایہ

کر پُرزے جلد وقایہ
ایہا دل قرآن کتابے

ہے پرم گیان دی دلڑی
ہے بید پُران دی دلڑی

ہے جانِ جہان دی دلڑی
دل بطن بطون دا بابے

دِل تُب ہے کون ومکاں دا
دِل غایت اصل جہاں دا

دِل مرکز زمیں زماں دا
بیا کوڑ پلال حجابے

وچ صورت دے ناسوتی
وچ معنے دے ملکوتی ہا

جبروت اتے لاہوتی
دِل اندر سب اسبابے

رکھ انتر دھیان فریدی
ست سکھڑیں پیر مریدی

ہے ڈوری سخت بعیدی
جی سُکھڑیں کان عذابے

اردو

مدارجِ تصوف

دہر اک وہم اک خیال اک خواب
جس کی سب صورتیں ہیں نقش برآب

پوچھتا ہے جو تو حقیقت کو   باز رکھ اپنی چشم عبرت کو
جان بحرِ محیط وحدت کو
اور جو کثرت ہے وہ ہے مثلِ حباب

بے حقیقت ہے شان دوئی کی   خود پرستی اٹھان دوئی کی
جب نکلتی ہے جان دوئی کی
باقی رہتا ہے صرف آب ہی آب

نہیں کافی تجھے کفایہ بھی   اور ہادی نہیں ہدایہ بھی
چاک کر نسخۂ وقایہ بھی
صفحۂ دل ہے آسمانی کتاب

دل ہی رکھتا ہے بس پریم کا گیان   ہے یہی وید اور یہی ہے پران
دل ہے تخلیقِ کائنات کی جان
دل ہے بطنِ بطون کا اک باب

دل ہے لب و لبابِ کون و مکاں   دل ہی ہے مقصدِ بنائے جہاں
دل ہی ہے مرکزِ زمین و زمان

باقی سب جھوٹ اور فریب و حجاب

دِل کے اندر ہے شکل ناسوتی　　اس کی گہرائی راز ملکوتی

یہ ہے جبروتی اور لاہوتی

دل میں ہیں جا گزیں تمام اسباب

اے فریدؔ اس سے لو لگا ہر آن　　چھوڑ پیری مریدی کی یہ دکان

اِس بلا سے ہے بُعد کا امکان

ہے یہ راحت کے راستے کا عذاب

خواجہ صاحب کی اُردو شاعری

جیسا کہ پہلے ذکر کیا جا چکا ہے، خواجہ صاحب ملتانی کے علاوہ ہندی، سندھی، پوربی، عربی، فارسی اور اردو میں بھی شعر کہتے تھے۔ لیکن ملتانی کے بعد جس زبان میں انہوں نے سب سے زیادہ شعر کہے ہیں وہ اردو زبان ہے۔ اردو میں انہوں نے ایک مکمل دیوان بھی مرتب کیا تھا جو آج کل نایاب ہے۔ گذشتہ اوراق میں دوسری زبانوں کے اشعار کے نمونوں کے ساتھ کچھ اُردو اشعار بھی درج کیے گئے تھے یہاں ہم ان کی اردو شاعری کا علیحدہ جائزہ لیتے ہیں

خواجہ صاحب کا اردو دیوان حمد و نعت سے شروع ہوتا ہے دیوان کی پہلی غزل کا مطلع ہے۔

ثنائے حق ادا ہو کس طرح تسوید انساں سے
کہ ہے ترکیب جس کی اک خطا سے اور نسیاں سے

اس کے بعد خلفائے راشدین کی تعریف ہے۔ اور مقطع میں اختتام دیوان کا اعلان ہے۔

فریدؔ اب افتتاحِ دفترِ دیوان ہو جائے
کہ تا دیوانے بن جائیں ہزاروں تیرے دیواں سے

دوسری غزل میں اپنے پیر و مرشد خواجہ فخرِ جہاں سے اظہارِ عقیدت و محبت کیا ہے۔ اس کے بعد خالص غزلیں شروع ہوتی ہیں۔ جنہیں عاشقانہ اشعار کے علاوہ متصوفانہ شعر بھی ملتے ہیں۔ انہی میں ایک غزل ان کے والد خواجہ خدا بخش کی شان میں ملتی ہے۔ چند شعر ملاحظہ ہوں۔

محبوبِ حق ہے خواجہ خدا بخش نام ہے
ملک فنا و فقر کا جس سے نظام ہے
جو نورِ لم یزل ہے سبھی تجھ میں ہے عیاں
جو حسنِ لایزال ہے تجھ پر تمام ہے
سب کے نصوص چار ہیں میرے یہ تین ہیں
قرآن ہے حدیث ہے تیرا کلام ہے
چاہے قبول کر اسے چاہے نہ کر قبول
شاہا فریدؔ تیرا ازل سے غلام ہے

خواجہ صاحب کی اردو غزلوں میں ملتانی کافیوں کی سی روانی نہیں نہ الفاظ کی وہ نشست و برخاست اور مصرعوں کی وہ چست بندش ہے جو ان کی کافیوں کا طرۂ امتیاز ہے تاہم جدتِ مضمون اور ندرتِ خیال کے نمونے جا بجا ملتے ہیں۔

ایک غزل میں خمِ زلفِ یار کو زلفِ مضطرب کہکر کتنی دلچسپ بات

کہی ہے۔

اس زلفِ مضطرب کی یہ تاثیر دیکھیو اپنی مثال مجھکو بھی مضطر بنا دیا

مسیحا کو جلاد کسی نے نہیں کہا ہوگا۔ لیکن یہ شعر ملاحظہ ہو

وہ مسیحا وش مجھے جلاد سے کچھ کم نہیں نزع کی حالت میں مجھکو چھوڑ کر جاتا رہا

غمزہ اگر خونخوار ہو تو اس کے کشتہ کے لئے خوں بہا ترچھی نظر سے دیکھنا ہے

فرید اس غمزۂ خونخوار سے کشتہ ہوا تو کیا
کہ ہے یہ دیکھنا ترچھی نظر سے خوں بہا میرا

ابروئے کماں کی نگہ کے تیر سے۔ فلک اور ہلال میں خم پڑ گیا۔

اس ابروئے کماں کی نگہ کا لگا ہے تیر کیا خم پڑا ہے دیکھو فلک کو ہلال کو

مہندی کو نسخ ید بیضا سے تشبیہ دی ہے۔ کہتے ہیں۔

طور کے نور کی اور وادیِ ایمن کی قسم تیری مہندی کو میں نسخ ید بیضا سمجھا

خواجہ صاحب کی ملتانی کافیوں میں رجائیت کا رنگ غالب ہے خاص طور پر اُن کی بہاریہ شاعری ان کے تمام ملتانی کلام کی جان ہے لیکن جہاں تک اردو شاعری کا تعلق ہے اس میں رجائیت کم اور یاسیت کا عنصر زیادہ ہے۔ ایک جگہ کہتے ہیں۔

بوستانِ دل میں جب سے عشق آیا ہے فرید
گلبنِ اندوہ و غم کا برگ و بر پیدا ہوا

آگے چل کر یہ گلبنِ اندوہ و غم ایک تناور درخت بن جاتا ہے اور اس میں طرح طرح کے پھول آپنے لگتے ہیں۔

چند شعر دیکھیے۔

بیتِ حزن میں مجھکو بٹھا کے چلا گیا
آتشکدے میں جاں کو جلا کے چلا گیا

دم ضعف سے میرا نہیں جاتا نہیں آتا
اس حال میں بھی رشکِ مسیحا نہیں آتا

میری اے آہ! تجھ پر درد کھاتا ہے سبھی عالم
ولے اس سنگدل پر کچھ اثر ہووے تو میں جانوں

قیس و فرہاد نصیحت کے لیئے آتے ہیں
عجب آشفتہ میں وحشت کے بیابان سے ہوں

آرام میری جان کو شام و سحر نہیں
جس دن سے میرے پاس وہ آرام بر نہیں

ہیں شاہِ غم ہوں خونِ جگر کی شراب ہے
میرے لئے مرا دلِ بریاں کباب ہے

اس کو کیا اطعمہ اور اشربہ سے لذت ہو
جو کہ درد و غم و حسرت کی غذا کھاتا ہے

گر سوز گہ گداز دکھے درد و گاہ غم
آتے ہیں دل کے خانہ میں مہماں نئے نئے

ناصور دل میں آبلہ پائیں جگر میں داغ
کیا خوشنما ہیں پھول ہمارے بہار کے

یہ ساری کی ساری غزل درد و غم میں ڈوبی ہوئی ہے۔

ایسے دردوں میں مبتلا ہیں ہم — گویا عینِ غم و بلا ہیں ہم
بن گئے ہیں جہاں سے بیگانہ — جب سے اس بُت سے آشنا ہیں ہم
اتنا واجب نہیں ہے جور و ستم — اے بُتو! بندۂ خدا ہیں ہم
خواب میں بھی نہیں ہے وصل نصیب — بے نصیبوں کے پیشوا ہیں ہم

ان کی ایک غزل کا یہ مقطع تو ان کی یاسیت پہ مہرِ توثیق ثبت کر دیتا ہے

نام میرا سن کے راحت بھاگ جاتی ہے فرید
ہاں مگر آیا ہوں میں رنج و محن کے واسطے

اس اظہارِ حقیقت کے بعد خواجہ صاحب غم کو خانۂ دل کے لئے رشک ارم بتاتے ہیں اور اس کی بقا کے لئے دعا کرتے ہیں۔

جس کی رونق سے ہے یہ خانۂ دل رشکِ ارم
ایک غم سلّمہ اللہ تعالیٰ دیکھا

خواجہ صاحب کی غزلوں میں عشق کی وہ تمام کیفیات ملتی ہیں جو پرانے غزل گو شعرا کا خاصّہ رہی ہیں۔ مثلاً عاشق کی حرماں نصیبی جورِ فلک۔ محبوب کی بے وفائی۔ رقیب کی مخالفت۔ ناز و اندازِ حسن اور شیخ و واعظ کی مذمّت۔

شبِ فرقت کی غضبناکی ملاحظہ ہو۔

شعلہ ہے برق، اشک ہے باراں۔ فغاں ہے رعد
فرقت کی شب ہے یا یہ غضب کا سحاب ہے

جورِ فلک کا شکوہ اس طرح کرتے ہیں۔

جورِ فلک کی کیا میں شکایت کروں فرید
بد نام ہر گلی ہیں مجھے بر ملا کیا

زمانہ کی کجروی بھی ملاحظہ ہو۔

کیا کج روش ہے دہر کی دشمن بنا وہی
جس پر ازل سے میں نے سر اپنا فدا کیا

محبوبِ ستم کیش کا سراپا کھینچتے ہیں۔

ویسا بیدار سراپا دل و دین کا دشمن
شوخ و بدمست و ستمگار نہ دیکھا نہ سُنا

ایک اور شعر دیکھیے

سر خاک رقیبوں کا جگر چاک ہے غم سے
کچھ رحم تجھے او بُتِ ترسا نہیں آتا

محبوب بدگمان ہو تو عاشق کے مرنے پر بھی اس کی بدگمانی نہیں جاتی

لاشے کو مرے دیکھ کے کہنے لگا ہنس کر
کیا مکر کا ڈھنگ اس نے نکالا ہے اک اعلےٰ

محبوب کی چشم و مژہ کی تعریف سنیے۔

ہے نیزہ مژہ، تیرِ قدر سے بھی زیادہ
ہے تیغِ نگہ تیغِ قضا سے بھی بہت تیز

دستِ حنائی کی کرشمہ سازی دیکھیے

حنا کے رنگِ ناری نے کیا آتش پرست اپنا
یدِ بیضا کو شمعِ طور کو خورشیدِ تاباں کو

نگاہِ ناز کی جادوگری بیان کرتے ہیں۔

اللہ رے فرطِ حسن کہ اس کی نگاہ ناز ۔۔۔ جادو کہیں ہو سحر کہیں معجزہ کہیں

ہیکلِ حسن عبارت ہے چشم و ابرو۔ خال و خط اور زلف و رُخ سے یہ اگر سب موزوں و مطبوع ہوں تو حُسن مکمل ہوتا ہے۔

چشم ہو ابرو ہو خال و خط ہو رُخ ہو زلف ہو
اپنی اپنی جا پہ سب مطبوع اور موزون ہے

رقیب کو کون عاشق گوارا کرتا ہے۔ مومن نے غم میں بھی غیر کی شرکت پسند نہیں کی تھی اور کہا تھا

شرکتِ غم بھی نہیں چاہتی غیرت میری
غیر کی ہو کے رہے یا شبِ فرقت میری

اسی قسم کا مضمون خواجہ صاحب نے باندھا ہے۔

جس جا پہ ہو رقیب بھی ہم محفل اے فرید
بد جانتے ہیں ہجر سے ایسے وصال کو

رقیب سبھی کو کانٹے کی طرح چبھتے ہیں۔ خواجہ صاحب نے خود کو "غیروں کے لئے خار مغیلاں بنایا ہے۔

اگرچہ خس سے بھی کم مرتبہ ہوں کوئے جاناں میں
ولے پاؤں میں غیروں کے لئے خارِ مغیلاں ہوں

واعظوں اور ناصحوں کو ہمیشہ شاعروں نے ملامت کا نشانہ بنایا ہے چنانچہ خواجہ صاحب بھی کہتے ہیں۔

تو اپنے زہد لاحاصل پہ نازاں ہو نہ اے واعظ۔ کہ تیرے رشتۂ تسبیح سے زنّار بہتر ہے

خواجہ صاحب کی ملتانی شاعری کے ذیل میں ان کے رومان کا ذکر کیا جا چکا ہے۔ ان کی کافیوں میں جہاں اس قسم کی متعدد شہادتیں ملتی ہیں کہ وہ کسی لیلیٰ وش کی نگاہوں کے گھائل ہو گئے تھے وہاں ان کا اردو کلام بھی اس عشق مجازی کی گواہی دیتا ہے۔ دیکھیے ایک جگہ وہ خود کہتے ہیں۔

اگر محروم ہوتا عشقِ جاناں سے یہ دل میرا
عبث تھا اے فریدؔ اس عالمِ ایجاد میں آنا

ایک اور جگہ کہتے ہیں کہ جو بت پرستی میں ہنرمند ہو وہ "حضرت دلبرؒ" کے رُخ کا نظارہ کرنے کے لائق ہے۔ شعر سنیے

لائقِ دید رُخِ حضرتِ دلبر کا ہے وہ
بت پرستی میں جسے خوب ہنر آتا ہے

خواجہ صاحب نے اپنی کافیوں میں تو عشق کے مقامات بڑے دلسوز انداز میں بیان کیے ہی ہیں۔ لیکن اردو غزلوں میں بھی کہیں کہیں اس کے عمدہ نمونے ملتے ہیں "دیکھیے یہ نہ کروں تو کیا کروں" کی دلچسپ ردیف میں کس مزے سے کہتے ہیں

مدرسہ کو فنا کروں یہ نہ کروں تو کیا کروں
بتکدے کی بنا کروں یہ نہ کروں تو کیا کروں
چھوڑ کے زہد و خانقہ بن کے مرید میکدہ
عشق کو پیشوا کروں یہ نہ کروں تو کیا کروں

وہ کہتے ہیں کہ کوچۂ عشق میں علاّمگی کام نہیں دیتی۔

اگرچہ فقہ و نحو و صرف و منطق میں ہوں علاّمہ
مگر مکتب میں اہلِ عشق کے اک طفلِ ناداں ہوں

بے شعوری میں ہی عشق کا کمال ہے

عشق کے کوچے میں جس پر بے شعوری ختم ہے
مکتبِ علم و عمل سے اس پہ دوری ختم ہے

عاشقی کے صوم و صلواۃ کیا ہیں۔ ذرا خواجہ صاحب کی زبان سے سنیئے۔

نماز یہ ہے کہ ہوں پنج وقت ساجدِ بُت
صیام یہ ہے کہ ہوں صبح و شام ہم لبِ جام

سنا ہے خواجہ صاحب کے پاس تسخیر کا عمل تھا۔ جسے ایک نظر دیکھ لیتے وہ ان کا گرویدہ ہو جاتا تھا یہ بات ابتک قصہ کہانی کی طرح لوگوں کی زبانی سُنی تھی۔ خواجہ صاحب کے اردو کلام سے اس کی تصدیق بھی ہو گئی

دل لگی، جیسے اسے کھینچ لیا ہے پل میں
یہ عجب نسخۂ تسخیر لئے پھرتے رہیں

ایک اور شعر ملاحظہ ہو۔

سنگدل جیسا ہو میرے روبرو ہوتا ہے موم
یہ میری صورت میں حضرتِ عشق کی تاثیر ہے

خواجہ صاحب کے اردو کلام میں تصوف کا وہ رنگ نہیں جو اُن کی کافیوں میں ملتا ہے۔ تاہم ان کی بعض غزلیں مکمل طور پر اور بعض غزلوں کے کچھ اشعار متصوفانہ ضرور ہیں۔ بالخصوص ان کا پسندیدہ موضوع "وحدت الوجود" ان میں نمایاں نظر آتا ہے۔ چند شعر ملاحظہ ہوں۔

بے پردہ نور دوست کا جز کل میں ہے عیاں
غنچے میں گل میں سرو میں سنبل میں ہے عیاں
خالی نہیں ہے نورِ قدم سے عدم کوئی
جتنا ہے گل میں اتنا ہی بلبل میں ہے عیاں

ہر تار رگ میں راز حقیقت کا ہے سرور
کیا انتظارِ دار مرے جسمِ زار کو

موجود جو ہے جگ میں اسم و صفات حق ہے
اسم و صفات کیا ہے خود عین ذاتِ حق ہے

ایک داں ہوں ایک خواں ہوں ایک جو ہوں ایک گو
سب میں اس کو دیکھتا ہوں غیر سے مطلب نہیں

ہر رنگ میں ظہور ہے بے رنگ یار کا
پرتو ہے گر خزاں میں کہ جلوہ بہار کا

ہستی ہے وہ جو ہست ہے اور ہست ساز ہے
کیا اعتبار ہستیٔ ناپائدار کا

خواجہ صاحب کے حالاتِ زندگی میں یہ بیان کیا جا چکا ہے کہ خواجہ صاحب کو مال و دولت سے کبھی محبت نہیں ہوئی اس کے باوجود کہ خدا نے انہیں ضرورت سے زیادہ دیا تھا اور ان کے معتقدین کی جانب سے نقد و جنس کی صورت میں انہیں کافی وصول ہوتا رہتا تھا لیکن ان نذرانوں کے آنے کی وجہ ہوتی تھی کہ وہ انہیں ضرورتمندوں اور مستحقوں میں تقسیم کرنے میں چند محوں کی بھی تاخیر گوارا نہیں کرتے تھے وہ اپنے ارادتمندوں کو بھی یہی نصیحت کرتے تھے کہ دولت انسان کو خدا سے دور کر دیتی ہے اس لئے جتنی جلدی ممکن ہو اسے اپنے سے جدا کر دینا چاہیئے۔ ان کا یہ نظریہ بھی حقیقت پر مبنی تھا کہ جو لوگ دولت کے لئے بے قرار رہتے ہیں دولت ان سے دور بھاگتی ہے اور جنہیں دولت کا پاس نہیں ہوتا انہیں دولت کی کمی نہیں ہوتی۔ اسی حقیقت کو ذیل کے شعر میں بیان کیا ہے

آزاد دل سے اپنے یہ نکتہ عجب سُنا
ہے پاس اس کے زر کہ جسے پاسِ زر نہیں

سیم وزر سے اپنی بے طلبی کو اس طرح ظاہر کرتے ہیں۔

سیم سے مطلب نہیں زر کی نہیں خواہش کبھی
خاک اس کے کوچے کی میرے لیئے اکسیر ہے

خواجہ صاحب کو ایسے اشعار کہنے میں بڑی مہارت حاصل ہے جن میں مختلف زبانوں کے ٹکڑے جوڑ دیئے گئے ہوں۔ ان کے ملتانی زبان کے دیوان میں بھی ایک کافی ایسی ملتی ہے جس میں ملتانی زبان کے ٹکڑوں کے ساتھ فارسی کے ٹکڑے لگائے ہیں۔ ایسی ہی ایک اردو غزل کے یہ اشعار دلچسپی سے خالی نہ ہوں گے۔

درونِ جانم فگار کردی، خدنگِ غمزہ چلا کے ہم کو
بہ بسترِ ناز خفتہ بودم، وہاں سے ناگہ اٹھا کے ہم کو
بحسنِ خوباں چہ کار دارم کہ حضرتِ بے مثال یارم
ز عشق صورت نمود فارغ ظہور معنی دکھا کے ہم کو
ہمیشہ ہمدم رقیب باشد کروں شکایت میں کس کے آگے
گہے نہ پرسید حال مارا حضور اپنے بٹھا کے ہم کو
فرید بیدل چہ عرض سازد اسی جفا کیش کے ستم کا
جو برقِ خندہ بہر زمانے زنارِ حسرت جلا کے ہم کو

ناسخ کی زمین میں ایک غزل ہے جس کا مطلع یہ ہے

دم ضعف سے میرا نہیں جاتا نہیں آتا
اس حال میں وہ رشکِ مسیحا نہیں آتا

اسی غزل میں یہ شعر خواجہ صاحب کی خود اعتمادی کا آئینہ دار ہے

اس ملک میں ہے کون کہ نظم اپنی کو سمجھے
ناسخ کو بھی یہ درد کا نسخہ نہیں آتا

ناسخ اور نسخہ کا تلازمہ قابل غور ہے۔ خواجہ صاحب کی اردو شاعری لسانی اعتبار سے ان کی ملتانی زبان کی شاعری کے ہم پلہ نہیں لیکن اس کے تیور یہ ضرور بتاتے ہیں کہ ان کا خالق کوئی معمولی درجے کا شاعر نہیں کیونکہ اس میں خیال آفرینی بھی ہے اور وحدت فکر بھی

اگر خواجہ صاحب۔ ملتانی زبان میں کلام کہنے کے بجائے صرف اردو کی طرف ہی توجہ دیتے تو یقیناً ان کی اردو شاعری کا معیار بہت بلند ہوتا۔ اس وقت ان کی اردو شاعری کو اس وجہ سے زیادہ قدر و منزلت سے دیکھنا چاہیئے کہ انھوں نے اپنی مادری زبان ملتانی کے دوش بدوش اردو کی ترقی و فروغ میں بھی حصہ لیا۔

مجھے امید ہے کہ اس مضمون کی اشاعت کے بعد اردو ادب کی تاریخ میں خواجہ صاحب کا نام ضرور جگہ پائے گا۔

آخر میں خواجہ صاحب کی چند اردو غزلیں درج کی جاتی ہیں۔

بُت کے ہر ناز کو میں رازِ خدا کا سمجھا   اس کے دشنام کو اعجازِ مسیحا سمجھا

میں نے بتخانے کو بھی کعبے کا نقشہ سمجھا — اپنے لبیک کو ناقوسِ کلیسا سمجھا

ذوقِ وحدت سے ہر اک چیز کو اعلیٰ سمجھا — چغد کو مثلِ ہما زاغ کو عنقا سمجھا

میں نے ہر قطرے کو دریا سے زیادہ سمجھا — ذرّے کے نور کو خورشید سے بالا سمجھا

مے پرستی میں مرے دل کی ترقی دیکھو — خمِ گردوں کو اک ادنیٰ سا پیالہ سمجھا

کیوں نہ واجب ہو مجھے سجدہ تمہارا اے بت — میں نے نقشِ کفِ پا تیرے کو کعبہ سمجھا

طُور کے نُور کی اور وادیٔ ایمن کی قسم — تیری مہندی کو میں نسخِ خطِ بیضا سمجھا

عشقبازی میں مرا مرتبہ ایسا ہے فریدؔ
قیس بھی مجھکو گرو آپ کو چیلا سمجھا

تیری سے طرز دیکھی نہ الٹی ادا کہیں — آفت کہیں غضب کہیں برق و بلا کہیں

ساجد ہیں خاکِ کوچۂ جاناں کے روز و شب — مرسل کہیں نبی کہیں اور اولیا کہیں

اللہ رے فرطِ حسن کہ اس کی نگاہِ ناز — جادو کہیں ہے سحر کہیں معجزہ کہیں

تیرا ستم ہے کافۂ عشاق کیلئے — شفقت کہیں کرم کہیں مہر و وفا کہیں

جاں دادگانِ حق میں ہر شمشیر جوریار — صحت کہیں حیات کہیں خوں بہا کہیں

ہیں مست اس نگاہ سے اس کے فریدؔ وش
زاہد کہیں فقیہہ کہیں پارسا کہیں

زندہ ہوں خواہ بیجان جو کچھ کہ ہوں سو میں ہوں — پُر غم ہوں یا کہ سوزاں جو کچھ کہ ہوں سو میں ہوں

محرم کہے جاناں مقتولِ تیرِ ہجراں — مجبورِ دامِ حرماں جو کچھ کہ ہوں سو میں ہوں

پُر جوشِ نارِ فرقت مجروحِ نوکِ حسرت
سرگشتہ و پریشاں جو کچھ کہ ہوں سو میں ہوں

سرشار و رندِ بے دیں اندوہناک غمگیں
زار و نزار و حیراں جو کچھ کہ ہوں سو میں ہوں

سلطانِ ملکِ غربت شاہِ دیارِ کربت
خارِ خلیدہ درجاں جو کچھ کہ ہوں سو میں ہوں

ساجد بتوں کے رُو کا مشتاق انکی خُو کا
سر دفترِ محبّاں جو کچھ کہ ہوں سو میں ہوں

آفت رسیدہ دردِل گم گشتہ پائے در گل
مایوس کردہ دوراں جو کچھ کہ ہوں سو میں ہوں

سیّارِ دشتِ وحشت سیّاحِ یومِ حیرت
آوارۂ بیاباں جو کچھ کہ ہوں سو میں ہوں

کہتا ہے فخرِ عالم مجھ سے فریدؔ ہر دم
جگ میں عیان و پنہاں جو کچھ کہ ہوں سو میں ہوں

جب سے شاہِ عشق نے دل کو کیا تسخیر ہے
دشت و صحرائے جنوں مجھکو دیا جاگیر ہے

سنگدل جیسا ہو میرے رو برو ہوتا ہے موم
یہ مری صورت میں حضرتِ عشق کی تاثیر ہے

سیم سے مطلب نہیں زر کی نہیں خواہش مجھے
خاک اس کے کوچہ کی میرے لئے اکسیر ہے

کیا ہو کچھ حاجت اسے شیخ و برہمن کی فریدؔ
جس کا خود پیرِ طریقت وہ بتِ بے پیر ہے

دم ضعف سے میرا نہیں جاتا نہیں آتا
اِس حال میں بھی رشکِ مسیحا نہیں آتا

سرخاک رقیبوں کا جگر چاک ہے غم سے
کچھ رحم تجھے او بتِ ترسا نہیں آتا

تا کعبہ سمجھکر اسے مسجود بناؤں
کیوں ہاتھ ترا نقشِ کفِ پا نہیں آتا

اس بُت کے تصور نے مزا خوب دکھایا
رویا میں بھی کعبے کا ارادہ نہیں آتا

اس ملک میں ہے کون کہ نظم اپنی کو سمجھے نا سخ کو بھی یہ درد کا نسخہ نہیں آتا

دریائے محبت کا شناور ہوں فرید آج
افسوس کہ ہاتھ اپنے سہارا نہیں آتا

آرام میری جاں کو شام و سحر نہیں جس دن سے میرے پاس وہ آرام بر نہیں
آزاد دل سے اپنے یہ نکتہ عجب سنا ہر اس کے پاس زر ہے کہ جسکے پاس زر نہیں
سودا نہیں ہے جسمیں تیرا ہے وہ سر کہاں اور دل کہاں ہی جسمیں ترا نشو و نشتر نہیں
ہم بے کسوں کو جتنا بتوں سے ہے خوف و رنج کفار کو خدا سے جہنم کا ڈر نہیں

مت عرض کر فرید انہیں اپنی بے کسی
شکوہ عبث ہے ان کی توجہ ادھر نہیں

گلرخ سبھی غلام ہیں اس گلعذار کے سلطان حسن بندے ہیں اس شہسوار کے
ناصور دل ہیں آبلہ پا ہیں۔ جگر میں داغ کیا خوشنما ہیں پھول ہماری بہار کے
جو پاکباز جگ میں ہیں سب ان میں قید ہیں کیا کیا ہیں پیچ زلف کے ہر تار تار کے

ھل من مزید کہتے ہیں تیروں کیواسطے
نخچیر جو ہیں اس بت عاشق شکار کے

اے چرخ میری خاک بدن سے تو لوٹ گ۔ رندوں کو مے پلا اسے پیمانہ جوڑ کے
رضواں کو آرزو ہے شب و روز اے فرید بیٹھے گا اس کے کوچہ میں جنت کو چھوڑ کے

مطبوعات اردو اکادمی
جامعہ عباسیہ ، بہاولپور

۴ - فہرست مخطوطات کتب خانہ گیلانی اوچ
مرتبہ : ڈاکٹر غلام سرور

اوچ بر صغیر پاک و ہند میں ایک علمی مرکز کی حیثیت رکھتا تھا - اس کتاب میں کتب خانۂ اوچ کی تقریباً ۳۹۰ نادر کتابوں کی فہرست درج کی گئی ہے اور ان کی تفصیلات پر پوری شرح و بسط کے ساتھ روشنی ڈالی گئی ہے - (قیمت تین روپے)

۵ - کلید اقبال - - - - - - مرتبہ : ملک نذیر

اقبالیات پر اپنی طرز کی پہلی کتاب ہے - اب تک علامہ پر جو کچھ لکھا گیا ہے اس کے مفصل حوالہ جات درج کئے گئے ہیں - (قیمت پانچ روپے پچاس پیسے)

ملنے کا پتہ

دفتر اردو اکادمی ، جامعہ عباسیہ - بہاولپور

خواجہ غلام فرید علیہ الرحمۃ

(بہ شکریہ مخدوم فیروزالدین)